وَأَنزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ

سہ ماہی

البیان

کراچی

(سلسلہ نمبر ۲) دسمبر ۲۰۱۱ تا فروری ۲۰۱۲/محرم تا ربیع الاول ۱۴۳۳



مجلس البحث العلمي

AL-MADINA ISLAMIC RESEARCH CENTER



www.islamfort.com

وَاَنزَلنَا اِلَیکَ الذِّکرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَانُزِّلَ اِلَیھِم

سہ ماہی البیان کراچی

سلسلہ نمبر② دسمبر ۲۰۱۱ تا فروری ۲۰۱۲/محرم تا ربیع الاول ۱۴۳۳

زرِ سالانہ	160 روپے
فی شمارہ	40 روپے

بیرون ملک

زرِ سالانہ	12 ڈالر (علاوہ ڈاک خرچ)
فی شمارہ	3 ڈالر

Bank Al-Habib A/C NO :
1103-0081-002746-01-2

پتہ

المدینہ اسلامک ریسرچ سینٹر
مسجد سعد بن ابی وقاص ڈیفنس فیز 4
11 کمرشل اسٹریٹ، نزد نثار شہید پارک
وگذری پولیس اسٹیشن کراچی

Ph:+92-21-35896959
Mob+923322135693
WEBSITE:
WWW.ISLAMFORT.COM
E-MAIL:
khalidgoraya1@hotmail.com
info@islamfort.com

فہرست مضامین

عالمی سرمایہ دارانہ نظام روبہ زوال ہے۔

جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا وہ ناپائیدار ہو گا

خالد حسین گورایہ

آج کل یورپ کے متعدد ممالک میں عالمی سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف تحریکیں زور و شور پر ہیں۔ امریکہ سے لیکر اٹلی تک ان تحریکوں نے انتہائی زور پکڑ لیا ہے۔ نیویارک کی سڑکوں پر مین ہٹن، نیویارک کی "وال اسٹریٹ"[1] جہاں سے بورژوا طبقہ نے دنیا کو عالمی سرمایہ دارانہ نظام کے شکنجے میں کسنے کا آغاز کیا تھا اور جو کہ عالمی سرمایہ دارانہ نظام کے پنپنے کی مرکزی آماجگاہ سمجھی جاتی ہے، اس کی سڑکوں پر ہزاروں لوگ کتبے اور بینر اٹھائے یہ صدا بلند کر رہے ہیں کہ

(Capitalism isn't working)

(Another world is possible)

یورپ کی سرزمین پر اتنے وسیع پیمانے پر ہونے والے یہ مظاہرے، بینکوں پر حملے، وال اسٹریٹ پر قبضہ کی مہم اس کی پاداش میں ہونے والی سینکڑوں گرفتاریاں یہ صدائیں کسی مسلم یا بقول ان (اہلِ مغرب) کے بنیاد پرست قدامت پسند معاشرے سے نہیں، بلکہ سرمایہ داری اور مغربی تہذیب کے مراکز سے اٹھ رہی ہیں۔ سرمایہ داری نظام سے چھٹکارے کی صدا لگانے والے یہ لوگ کسی مسلم یا سوشلسٹ ملک کے مکین نہیں

---

[1] وال اسٹریٹ (Wall Street) امریکہ کے شہر نیویارک کی ایک مختصر شاہراہ ہے۔ اسے شہر کے مالیاتی مرکز کے تاریخی قلب کی حیثیت حاصل ہے اور نیویارک بازار حصص کا پہلا مستقل ٹھکانہ بھی یہی شاہراہ ہے۔ امریکی مالیاتی مارکیٹوں اور مجموعی مالیاتی اداروں کے لیے بھی "وال اسٹریٹ" کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔ نیویارک کے بیشتر مالیاتی اداروں کے صدر دفاتر اب وال اسٹریٹ پر موجود نہیں ہے بلکہ مین ہٹن کے زیریں اور مرکزی علاقوں، فیئر فیلڈ کاؤنٹی، کنیکٹیکٹ یا نیو جرسی میں ہیں۔ نیز اس کے علاوہ وال اسٹریٹ کی اصطلاح کا مفہوم ذرا وسیع معنوں میں بھی استعمال ہوتی ہے اسی بنا پر اب کسی بھی شہر کے اقتصادی مراکز کی وہ اہم شاہراہ جہاں بڑے کاروباری اداروں کے دفاتر واقع ہوں اسے وال اسٹریٹ کہا جاتا ہے۔ جس طرح کراچی، پاکستان میں واقع آئی آئی چندریگر روڈ کو "پاکستان کی وال اسٹریٹ" کہا جاتا ہے۔

بلکہ یہ لوگ وہ ہیں جو یورپ میں پلے بڑھے اسی معاشی نظام میں ان کی پرورش ہوئی انہیں کی زبان بولنے والے انہیں کا مذہب رکھنے والے ترقی کے عملدار خود کو ترقی یافتہ اور مہذب قوم کہلانے والے یہ سب وہی لوگ ہیں جو سراپا احتجاج ہیں۔ اس تمام صورت حال کو دوسری دنیا تک پہنچانے والا بھی مغربی میڈیا ہے جو ان رپورٹس کو نشر کر رہا ہے، اس پر پروگرامز ہو رہے ہیں۔ ان مظاہروں کا آغاز اس وقت ہوا جب دنیا کی بیس بڑی معاشی طاقتوں کے گروپ G:20 کا سربراہ اجلاس ہو رہا تھا۔ اس اجلاس میں شریک ممالک کے سربراہاں کو مظاہرین کی جانب سے یہ پیغام دیا گیا کہ یورپ میں کساد بازاری کی لہر امریکہ میں لاکھوں افراد کی بے روزگاری کا ذمہ دار کوئی اور نہیں بلکہ یہ سرمایہ دارانہ نظام اور اس میں مضمر خرابیاں ہیں۔

یہ تشویش صرف متاثرہ عوام میں نہیں بلکہ اس کا ادراک ان ممالک کے حکمرانوں نے بھی کر لیا ہے۔ اس لئے سرمایہ دارانہ نظام کے روحِ رواں اس نظام کی بقا بر قرار رکھنے کیلئے اپنے بنیادی اصولوں یعنی بے قید معیشت اور حکومتی اجارہ داری سے آزادی پر بھی سمجھوتہ کرنے کے لئے تیار ہیں۔ اس لئے G:20 سربراہ اجلاس کے اعلامیہ میں برطانوی وزیر اعظم گورڈن براؤن کا کہنا تھا کہ: حالیہ بحران نے عالمی مالیاتی نظام کی چولیں ہلا دی ہیں اس لئے معیشت اور مالیات کی کڑی نگرانی کی جائے گی۔ علامہ اقبال نے اس نظام کی انہی کھوکھلی بنیادوں کو دیکھ کر اور اس میں پنہاں ظلم کو محسوس کر کے کہا تھا کہ:

ابھی تک آدمی صید زبوں شہریاری ہے ¤¤ قیامت ہے کہ انسان نوعِ انسان کا شکاری ہے

وہ حکمت ناز تھا جس پہ خردمندانِ مغرب کو ¤¤ ہوس کے پنجہ خونیں میں تیغ کارزاری ہے

تدبر کی فسوں کاری سے محکم ہو نہیں سکتا ¤¤ جہاں میں جس تمدن کی بنا سرمایہ داری ہے

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر سرمایہ دارانہ نظام میں کیا خامی ہے جس کے باعث لوگوں کے جمِ غفیر کو سڑکوں پر آکر اور اس کی تبدیلی کا مطالبہ کرنا پڑا۔

اس سوال کا جواب ذرا تفصیل طلب ہے۔ تفصیل سے قبل ذرا اجمال بیان کرنا ضروری ہے تاکہ اس نظام کی خامی ہر ذہن میں جاگزیں ہو اور اس سے خلاصی کی جدوجہد کا شعور ہر مسلم میں بیدار ہو کیونکہ غالب مسلم معاشرہ بھی اسی نظام میں جکڑا ہوا ہے اور کی جگہ اسلام کے عادلانہ نظام معیشت کے نفاذ کی تگ ودو

کی جائے۔

بے قید معیشت، انتہا درجے کی خود غرضی، سود کی بنیاد پر پنپنے والا یہ نظام، سسٹم میں عامل کے ساتھ ہر جہت میں ہمہ گیر بے انصافی برتنا۔ اجتماعی معیشت کی باگیں محض چند خود غرض اور ہوس پرست ہاتھوں میں ہونا، یہ وہ چند بنیادی اصول ہیں جن کی بنیاد پر یہ نظام قائم ہے اور اب یہی بنیادی اصول جو اس نظام کی خصوصیات شمار کی جارہی تھیں اب اس کے زوال کا سبب بن رہی ہیں۔ اقبال نے اسی صورت حال کو دیکھتے ہوئے کہا تھا کہ:

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خود کشی کرے گی ¤¤ جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا وہ ناپائیدار ہو گا

دیارِ مغرب کے رہنے والو خدا[1] کی بستی دوکاں نہیں ہے ¤¤ کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زرِ کم عیار ہو گا۔

عالمی معاشی نظام:

دنیا میں جن معاشی و معاشرتی نظاموں نے عالمگیریت کی حیثیت حاصل کی وہ بنیادی طور پر چار قسم کے ہیں۔ جو کہ آج بھی مختلف معاشروں میں کسی نہ کسی شکل میں رائج ہیں۔

① جاگیر دارانہ نظام Feudal System ② اشتراکی نظام Socialism

③ سرمایہ دارنہ نظام Capitalism ④ اسلامی نظام معیشت۔

آج تاریخی اور زمینی حقائق اس بات کے گواہ ہیں کہ دنیا نے معیشت و معاشرت کے جتنے نظام بھی آزمائے وہ معاشرے کے تمام شعبہ ہائے زندگی سے متعلق افراد کے مسائل کے حل سے قاصر رہے، بلکہ ظلم و زیادتی اور حق تلفی کا عنصر ان نظاموں پر غالب رہا۔ یہی وجہ ہے کہ انسانیت کے خود تراشیدہ نظام اجتماعی و معاشرتی زندگی میں زیادہ دیر زندہ نہ رہ سکے اور اپنی موت آپ مرنے لگے۔

جبکہ اسلامی نظامِ معیشت دنیا کا وہ واحد نظام ہے جس نے زندگی کے تمام شعبہ جات، معاشرے کے تمام افراد، ہر طبقہ، اور دنیا کے کسی بھی ملک و قوم کے معاشرے کیلئے بہترین اور متوازی قوانین پر مبنی آئیڈیل نظام پیش کیا۔ اور جن قوموں نے اسے نافذ کیا انہوں نے ترقی تہذیب اور اخلاق کی چوٹی کو

---

[1] علماء سلف اللہ تعالیٰ کی ذات کیلئے لفظِ ''خدا'' کے استعمال کو غلط سمجھتے ہیں۔ چونکہ یہ لفظ شعر میں استعمال ہوا ہے اس لئے اسے تحریر کیا گیا ہے۔ پڑھنے والے اسے لفظ ''اللہ'' ہی پڑھیں۔

چھوا۔ معاشرہ کا ہر فرد امیر ہو یا غریب، چھوٹا ہو یا بڑا، کسی کا وارث ہو یا لاوارث ، بوڑھا ہو یا کمزور تمام کے حقوق محفوظ کیئے۔ اور خود غرضی' لالچ' ہوس پرستی' اجارہ داری' حق تلفی کو ختم کر کے ذاتی منافع کے محرک پر سخت پابندیاں عائد کیں تاکہ معیشت اور معاشرہ کسی قسم کی ناہمواری میں مبتلا نہ ہو۔

ہم اپنی اس تحریر میں ان چاروں نظاموں کے مکمل خدوخال اصول وضوابط اور ان کی خامیوں وخوبیوں پر بحث تو نہیں کر سکتے کیونکہ بات انتہائی طوالت اختیار کر جائے گی، اس لئے محض اس وقت سرمایہ داری نظام پر طائرانہ نظر ڈالیں گے۔ کیونکہ جب اشتراکیت اپنی موت مرنے لگی تھی تو مغرب میں بڑے شد ومد کے ساتھ بغلیں بجائی گئیں تھیں اور دعویٰ کیا گیا تھا کہ اشتراکیت چونکہ میدانِ عمل میں ناکام ہو چکی ہے اس لئے سرمایہ دارانہ نظام کی حقانیت ثابت ہو گئی ہے۔ آج اسی نظام کا جادو دنیا کے اکثر لوگوں کے سر چڑھ کر بول رہا ہے اور بہت سے مغربی تہذیب کے دلدادہ نام نہاد مسلمان بھی موجودہ معاشی مسائل کا حل اسی نظام میں ڈھونڈ رہے ہیں اور اسے عادلانہ نظام قرار دیتے ہیں مگر حقیقت یہ ہے یہ نظام آج خود واشنگٹن اور نیویارک میں اپنے تحفظ کیلئے لرزہ براندام ہے۔

سرمایہ دارانہ نظام کی تاریخ۔ تعریف۔ اصول وضوابط۔ اور خوبیاں اور خامیاں کیا ہیں۔ اور اسلام نے اس کے مقابلے میں ہمیں کیا بہتر متبادل معاشی ومعاشرتی اصول دئے ہیں اور موجودہ عالمی معاشی نظام کس طرح اور کن کن جہتوں سے اسلامی تعلیمات سے متصادم ہے ان تمام سوالات کا جواب تلاش کرنے کی سعی کریں گے انشاءاللہ ﴿ لِيَمِيزَ ٱللَّهُ ٱلْخَبِيثَ مِنَ ٱلطَّيِّبِ وَيَجْعَلَ ٱلْخَبِيثَ بَعْضَهُۥ عَلَىٰ بَعْضٍ فَيَرْكُمَهُۥ جَمِيعًا فَيَجْعَلَهُۥ فِي جَهَنَّمَ أُوْلَٰٓئِكَ هُمُ ٱلْخَٰسِرُونَ ﴿٣٧﴾ ﴾ الأنفال: ٣٧

ترجمہ: " تاکہ اللہ تعالیٰ ناپاک کو پاک سے الگ کر دے اور ناپاکوں کو ایک دوسرے سے ملا دے، پس ان سب کو اکٹھا ڈھیر کر دے پھر ان سب کو جہنم میں ڈال دے ایسے لوگ پورے خسارے میں ہیں"۔

معیشت کے بنیادی چار مسائل:

ہر معیشت میں چند بنیادی مسائل ہوتے ہیں جنہیں حل کئے بغیر معیشت کو چلانا ناممکن ہوتا ہے۔ یہ بنیادی مسائل چار ہیں۔

1. **ترجیحات کا تعین**: اس سے مراد یہ کہ انسانی ضروریات اور خواہشات بے شمار ہیں ، اور ان کے

مقابلے میں وسائل محدود ہیں۔ لہذا محدود وسائل کے ذریعہ تمام ضروریات کا پورا کرنا ممکن نہیں۔ اس لئے کچھ ضروریات وخواہشات کو مقدم کرنا پڑتا ہے اور کچھ کو مؤخر۔ یہ مسئلہ جس طرح ایک انسان کو پڑتا ہے اسی طرح ملک اور ریاست کو بھی پیش آتا ہے۔ مثلاً پاکستان کے پاس کچھ قدرتی وسائل، کچھ انسانی، کچھ معدنی اور کچھ نقد وسائل ہیں۔ یہ تمام وسائل محدود اور انسانی خواہشات لامتناہی ہیں۔ اب یہاں ہماری ریاست کو متعین کرنا پڑے گا کہ اس کے پاس موجود وسائل کو کہاں صرف کیا جائے اور کس چیز کی پیداوار کو ترجیح دی جائے۔

2. **وسائل کی تخصیص:** ایک ریاست کے پاس بہت سے سے وسائل پیداوار ہوتے ہیں۔ یعنی سرمایہ، محنت، زمین ان مختلف وسائل کو کن کاموں اور کس مقدار میں لگایا جائے؟ اس کا نام "وسائل کی تخصیص" ہے۔ مثلاً ہمارے پاس زمینیں ہیں۔ اب ہمیں یہاں یہ فیصلہ کرنا ہے کہ کتنی زمین پر چاول کاشت کئے جائیں۔ کتنی پر گندم اور کتنی پر گیہوں اور کتنی پر دیگر اجناس کاشت کی جائیں۔ یہی مثال فیکٹریوں اور کارخانوں کی ہے۔

3. **آمدنی کی تقسیم** : اب مذکورہ بالا وسائل میں جب ترجیحات کا تعین ہوگیا، اور وسائل کی تخصیص بھی کردی گئی تو ان وسائل کو کام میں لانے کے بعد اس کے نتیجے میں جو آمدنی اور پیداوار ہوتی ہے اس کو کس طرح اور کس بنیاد پر معاشرے میں تقسیم کیا جائے۔

4. **ترقی:** معاشیات کی اصطلاح میں ترقی سے مراد یہ ہے کہ اپنی معاشی حاصلات کو کس طرح ترقی دی جائے؟ یعنی پیداوار کے معیار کو پہلے سے بہتر بنایا جائے، اس کی مقدار میں اضافہ ہو، اور کس طرح نئی نئی ایجادات اور مصنوعات وجود میں لائی جائیں تاکہ معاشرہ ترقی کی منزلیں بہتر انداز سے طے کرے اور اسباب معیشت میں اضافہ ہو اور لوگوں کو آمدنی کے ذرائع مہیا ہوں۔

ان چار بنیادی مسائل کو ہر معاشی نظام کیلئے حل کرنا ضروری ہے۔

اب ذرا سرمایہ داری نظام کی تعریف، تاریخ، اور اصول ومبادی کا جائزہ لیتے ہیں۔

سرمایہ دارانہ نظام کیا ہے؟

تعریف: سرمایہ دارانہ نظام (Capitalism) ایک معاشی و معاشرتی نظام ہے جس میں سرمایہ بطور عاملِ پیدائش نجی شعبہ کے اختیار میں ہوتا ہے۔ اشتراکی نظام کے برعکس سرمایہ دارانہ نظام میں نجی شعبہ

کی ترقی معکوس نہیں ہوتی بلکہ سرمایہ داروں کی ملکیت میں سرمایہ کا ارتکاز ہوتا ہے اور امیر امیر تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس میں منڈی آزاد ہوتی ہے اس لیے اسے آزاد منڈی کا نظام بھی کہا جاتا ہے۔ اگرچہ آج کل کہیں بھی منڈی مکمل طور پر آزاد نہیں ہوتی مگر نظریاتی طور پر ایک سرمایہ دارانہ نظام میں منڈی مکمل طور پر آزاد ہوگی۔ جملہ حقوق، منافع خوری اور نجی ملکیت اس نظام کی وہ خصوصیات ہیں جس سے سرمایہ دارانہ نظام کے مخالفین کے مطابق غریبوں کا خون چوسا جاتا ہے۔ جدید دانشوروں کے مطابق آج سرمایہ دارانہ نظام اپنے اختتام کی طرف بڑھ رہا ہے اور ایک متبادل نظام کی آوازیں شدت سے اٹھنا شروع ہو گئیں ہیں۔[1]

سرمایہ دارانہ نظام کی تاریخ

ابتدائی ایام میں یورپ اپنی معیشت معاشرت اور سیاست میں رومن امپائر کے کلیسائی اور جاگیر دارانہ نظامِ (Feudal System) معیشت کے رحم وکرم پر تھا۔

چودھویں صدی سے سولہویں صدی کے مابین کا زمانہ یورپی تاریخ میں دورِ متوسط سے دورِ جدید کی طرف عبور کا زمانہ تھا، جب "بورژوا" (Bourgeois) نظام سامنے آیا جس کے میرِ کارواں سوداگر، اہلِ حرفہ اور بحری تجار وغیرہ تھے۔ یہ گروہ ایک عرصہ تک معیشت پر مکمل تسلط حاصل کئے بغیر جاگیر دارانہ نظام کے ہم رکاب ہوکر کمزور اور ناتواں عوام کا استحصال کرتا رہا۔ مگر اس مرحلہ میں "بورژوا" گروہ نے "لبرلزم" یعنی وسیع المشربی کے عنوان کے تحت کلیسا اور جاگیر دارانہ نظام سے سرد جنگ کا آغاز کردیا۔ بالآخر سولہویں صدی میں "بورژوا" گروہ نے سرمایہ اور فنی قابلیت اور تنظیمی صلاحیت کے اشتراک سے صنعت اور تجارت کا ایک نیا نظام کھڑا کیا جسے "سرمایہ داری نظام" کا نام دیا گیا۔

یہ اس نظام کی ابتدا تھی بعد ازاں اس میں بوقت ضرورت رفتہ رفتہ مزید اصلاحات سامنے آتی گئیں۔ یہاں تک کہ " جدید سرمایہ داری نظام" سامنے آیا۔ جو مندرجہ ذیل اصولوں پر مبنی تھا۔

سرمایہ دارانہ نظام کے اصول:

1. **آزادیٔ سعی کا حق:** تمام کے تمام افراد کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے ذرائع کو جہاں چاہیں اور

---

[1] ویکیپیڈیا

جیسے چاہیں استعمال کریں اور اس کے نتیجے میں ہونے والے نفع کا فائدہ اور نقصان کا خطرہ وہ خود برداشت کریں گے ۔ اس عمل میں ان کو مکمل آزادی حاصل ہے کہ اپنی پیداوار جتنی چاہیں بڑھائیں ۔ اشیاء کی قیمتیں اپنی من مانی سے متعین کریں ۔ اپنے کاروباری معاملات میں وہ مکمل آزاد ہیں جو شرائط طے کریں، جو ضابطے متعین کریں اور جن اصولوں پر چاہے اتفاق کریں۔ اور ان پر عمل درآمد کریں۔

2 **نجی ملکیت بغیر حدود و قیود کے ہوتی ہے:** اس ملکیت سے مراد انسان کے اپنے زیرِ استعمال رہنے والی اشیاء نہیں جیسے لباس، سواری، سامانِ خوردونوش، مکان اور فرنیچر وغیرہ بلکہ اس ملکیت میں ذرائع پیداوار وہ اشیاء بھی شامل ہیں جن سے انسان اپنی مختلف اشیاء پیدا کرتا ہے۔ مشینی آلات، مواد خام وغیرہ پہلی قسم کی ملکیت میں کے حوالے سے ہر نظام انفرادی حقوق ملکیت تسلیم کرتا ہے مگر تنازعہ دوسری قسم کا ہے۔ جدید نظام سرمایہ داری نظام میں دوسری قسم کی ملکیت اساس اور بنیاد تصور کی جاتی ہے۔

3 **مارکیٹ میں کمپٹیشن (مقابلے و مسابقت) کی فضا پیدا کرنا:** یہ اصول بقول سرمایہ داران کے معاشرے میں توازن وعدل کی فضا کو برقرار رکھنے میں مددگار بنتا ہے۔ کیونکہ جب مارکیٹ میں ایک ہی جنس اور ایک ہی چیز کے کئی پیدا کرنے والے خریدار اور سوداگر ہوں گے تو مقابلے میں آکر کسر وانکسار سے خود ہی قیمتوں کا ایک مناسب معیار قائم ہو جائے گا۔ اس طرح یہ نفع اندوزی نہ حد سے بڑھے گی اور نہ گھٹے گی۔

4 **قیمتوں کی آزادی کا نظام:** قیمتیں طلب و رسد کے توازن سے متعین ہوتی ہیں چاہے طلب مصنوعی ہو یا چاہے رسد کو سرمایہ دار قیمت بڑھانے کے لیے مصنوعی طور پر کم کریں یعنی قیمتوں کے نظام کی آزادی اور طلب اور رسد کی ضروریات کے مطابق اس آزادی کو مطلق کرنا ، اور سامان کو فروغ دینے کے لئے کم قیمت کے اصول کو بنیاد بنانا۔

5 **ذاتی منافع کا محرک عمل ہونا:** مختلف ذرائع اور طریقوں سے منافع کا حصول۔ اس اصول کو سرمایہ داری کے حامیوں کے نزدیک دنیا میں سب سے بڑا محرکِ عمل ہے۔ یعنی ذاتی نفع کا لالچ افراد سے

اجتماعی مفاد کی خدمت خود ہی لے لے گا جو کسی اور ذریعہ سے نہیں لی جاسکتی۔

5 **مالک اور ملازم کے حقوق میں امتیازی برتاؤ:** اس نظام میں اجیروں کی اجرت کے بڑھنے اور گھٹنے کا تعلق مالک کے منافع اور فائدہ کے بڑھاؤ گھٹاؤ سے نہیں بلکہ ملازمیں کے زیادہ ہونے اور کام لینے والے کے کم ہونے اور ملازمین کے کم ہونے اور کام لینے والوں کے زیادہ ہونے سے ہے۔ پہلی صورت میں اجرتیں کم ہوں گی اور دوسری صورت میں اجرتیں زیادہ ہوسکتی ہیں۔

6 **ریاست کی عدم مداخلت:** بقول سرمایہ داروں کے کہ منڈی کی قوتیں خود کو درست کرنے کی طاقت رکھتی ہیں چنانچہ سرمایہ دارانہ نظام میں حکومت یا کسی ادارہ کی منڈی میں مداخلت کا تصور حقیقی سرمایہ دارانہ نظام کی روح کے خلاف ہے۔ بلکہ ریاست کی ذمہ داری محض یہ ہے کہ وہ منصف نگران اور محافظ کی خدمت انجام دے نہ یہ کہ خود تاجر اور صنّاع یا زمیندار بن بیٹھے، یا پھر اپنی خلل اندازی سے تاجروں اور صنّاعوں کے کام میں رکاوٹیں ڈالے۔ الغرض سرمایہ دارانہ نظام بنیادی طور پر تقاضا کرتا ہے کہ منڈی مکمل طور پر آزاد رہے، سرمایہ کی ترسیل اور نقل وحرکت آزادی سے ہو، منافع کی مقدار کو حکومت یا کسی اور ادارہ کے اختیار میں نہ لایا جائے۔ بلکہ اس نظام میں پنپنے والی معیشت بے قید معیشت ہو جس میں ہر شخص کو حق حاصل ہو کہ وہ جس چیز کا چاہے مالک بنے۔ جس طرح چاہے نفع کمائے۔ بغیر کسی کی مداخلت اور اخلاقی حدود وقیود کے۔

سرمایہ دارانہ نظام نے ان چاروں مسائل کو قانون طلب ورسد کے تحت حل کرنے کی کوشش کی مگر اس کے نتیجے میں جو معاشرے میں خرابیاں اور بگاڑ پیدا ہوا اس کو کنٹرول کرنا ناممکن ہوگیا۔

سرمایہ دارانہ نظام میں پائی جانی والی خرابیاں:

بنیادی طور پر یہ بات ذہن نشین رہنی چاہئے کہ جو نظام بھی بشری تخلیق اور اس کے افکار کی پیداوار ہوتا ہے وہ غیر مکمل نظام ہوتا ہے۔ بخلاف اس نظام کے جو انسانیت کو رب اللعالمین کی طرف سے دیا گیا ہو، جو ہر بشر کی طبیعت، ضرورت اور اس کو پورا کرنے کے طریقہ کو جانتا ہے۔ اس لئے سرمایہ دارانہ نظام کی خرابی یہی ہے کہ یہ نظامِ الٰہی کے خلاف نظام تشکیل پایا ہے۔ اس نظام میں اگرچہ انسانیت کے فطری اصولوں کو بنیاد بنایا گیا ہے مگر اس فطرت کو غلط اور مذموم مقاصد کیلئے استعمال کیا گیا۔ اور اس

تمام نظام کی بنیاد محض ان فطری اصولوں پر ہی نہیں بلکہ اس کے ساتھ چند غلط اصولوں کی بھی آمیزش کی گئی ہے ، اور چند ان فطری اصولوں کو نظر انداز بھی کیا ہے جو ایک فطری نظام معیشت کیلئے اتنے ہی ضروری تھے جتنے کے ان کے متعین کردہ اصول۔ لہذا صورت حال یہ ہو چلی کہ وہ اصول وضوابط جن کے ذریعہ سرمایہ دارانہ نظام کے سرخیلوں نے مبالغہ آمیزی میں شدت لا کر پوری دنیا تک پھیلایا تھا وہی خصوصیات اس نظام کی تباہی کا سبب بننے لگیں۔ ذیل میں اس نظام میں پائی جانے والی چند خامیوں کا تذکرہ کرتے ہیں: ﴿لِّيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ وَيَحْيَىٰ مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ ﴿٤٢﴾﴾ الأنفال: ٤٢

ترجمہ: "تاکہ جو ہلاک ہو اور جو زندہ رہے، وہ بھی دلیل پر (حق پہچان کر) زندہ رہے"۔

1. **انانیت اور خود غرضی:** اس نظام میں ایک یا ایک سے زائد افراد کا مارکیٹ پر تسلط ہوتا ہے جو اپنی خواہشات اور مفادات کے حصول کیلئے تگ ودو کرتے ہیں معاشرے کی ضرورت اور عمومی مصلحت کا احترام کئے بغیر۔ اسی لئے لوگوں کی اکثریت بھوک وافلاس سے مر رہی ہے اور صاحبِ ثروت لوگوں کی شاہ خرچیاں ختم نہیں ہوتی۔

2. **ذخیرہ اندوزی:** اس میں ایک مالک مال کو اسٹاک اور ذخیرہ کر لیتا ہے جب وہ مال بازار سے ختم ہو جاتا ہے اور طلب بڑھ جاتی ہے تو ضرورت مندوں کی ضرورت اور مجبوری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ڈبل قیمت میں فروخت کرتا ہے۔

3. **سرمایہ دارانہ نظام میں فردی ملکیت کی حد سے زیادہ تقدیس اور حفاظت کی گئی ہے** اس کے برعکس کیمونسٹ نظام میں اس کو سرے سے ختم ہی کر دیا گیا ہے۔

4. **بے قید مسابقت اور منافست:** سرمایہ داری کا یہ اصول انسانی زندگی کو مسابقت کا اکھاڑا بنا دیتا ہے کہ جس میں سب لوگ ایک دوسرے پر غلبہ اور زیادہ کمانے کی دوڑ میں بازی لے جانے کی کوشش کرتے ہیں جس کی وجہ سے زندگی جنگل بن جاتی ہے جس میں طاقت ور کمزور کو کھا رہا ہوتا ہے۔ اور اس کا اکثر نتیجہ کمپنیوں اور فیکٹریوں کی تباہی کا باعث بنتا ہے۔

5. **لیبر کی بلیک میلنگ اور ایک دستخط پر اس کے مستقبل کو داؤ پر لگا دینا۔** اس لئے کہ سرمایہ داری نظام میں لیبر اور مزدور کو قانون طلب ورسد کا سودا سمجھا جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے مزدور ہر وقت اس

خوف میں رہتا ہے کہ اس کو تبدیل کرکے کسی اور کو نہ لے آیا جائے جو کہ قیمت کم لے یا پھر خدمت اور کام زیادہ اچھا کرے۔

6 **بے روز گاری:** سرمایہ دارانہ معاشرے میں یہ ایک جانا پہچانا عمل ہے اور آج بھی آئے دن نیویارک اور شکاگو میں ہونے والے جاب فیئر ز میں سینکڑوں فٹ طویل قطاریں لگائے، نوکری کی تلاش میں کھڑے لوگ نظر آتے ہیں۔ مگر سرمایہ دارانہ نظام کے پاس اس کا کوئی حل نہیں ہے۔ اور یہ صورت حال اس وقت زیادہ شدت اختیار کر جاتی ہے جب رسد طلب سے بڑھ جائے۔

7 **پریشانی اور تنگی کی زندگی اور غریب طبقہ کا استحصال:** سرمایہ دارانہ نظام نے امیر کو تو امیر تر کر دیا مگر معاشرے کی دو تہائی سے زیادہ لوگ جو سطح غربت سے بھی نیچے زندگی گذار رہے ہیں۔ اور وہ خریدار جو بے روزگار ہیں اپنی معاش کیلئے انہیں روزگار مہیا نہیں۔ اس کا حل سرمایہ داروں کے پاس کیا ہے۔ بلکہ اس نظام نے ان کی زندگی مزید تنگی اور مشکلات میں ڈال دی۔ ذاتی نفع کا حصول لالچ و طمع اور امیر سے امیر تر ہونے کی دوڑ نے غریب لوگوں کو غریب سے غریب تر کر دیا۔ حتی کہ انسانیت کا شعور بھی لوگوں کے دلوں سے ختم ہو گیا۔ خیر خواہی درمندی نام کی چیز ہی ختم ہو گئی اور ان سرمایہ داروں کی خود غرضی اور لالچ سے ان کا یہ فلسفہ دم توڑ گیا کہ کسر وانکسار سے معاشرے میں قیموتوں کا توازن قائم ہو جائے گا بلکہ منڈی میں مصنوعی قلت پیدا کی جاتی ہے۔ حتی کہ آزاد معیشت کے سب سے بڑے وکیل آدم سمتھ کو بھی یہ اعتراف کرنا پڑا کہ: ''کم ہی ایسا ہوتا ہے کہ جب کاروباری لوگ کہیں جمع ہوں اور ان کی صحبت پبلک کے خلاف کسی سازش پر اور قیمتیں چڑھانے کیلیے کسی قرار داد پر ختم نہ ہو۔ حد یہ ہے کہ تقریبات تک میں مل بیٹھنے کا جو موقع مل جاتا ہے اس کو بھی یہ حضرات اس جرم سے خالی نہیں جانے دیتے''۔

اس تمام صورت حال میں معاشرے کے دونوں طبقات میں باہم جنگ وجدل کا آغاز ہوتا ہے اور اس کا انجام سب کے سامنے ہے۔

اسی ذاتی منافع کی دوڑ نے کتنی امتوں کو اقتصادی، فکری، سیاسی اور ثقافتی سطح پر امیر ملکوں اور قوموں کا غلام بنادیا۔ اسی سرمائے کی دوڑ نے کتنی جنگیں برپا کیں۔ جس کی پاداش میں لاکھوں لوگ مارے گئے۔

بے گھر ہو گئے۔

8 **سرمایہ دارانہ نظام کے حامی سیاست و حکومت میں اپنے حقوق کے تحفظ کیلئے لبرل اور جمہوری نظام کو استعمال کرتے ہیں** جو ساہو کاروں، مالداروں کی مشکلات کے حل کیلئے تو سینکڑوں ارب ڈالر کا بیل آؤٹ پیکیج دینے کو تیار ہوتے ہیں مگر کساد بازاری سے بے روزگار ہونے والوں کے لئے ان کے پاس کوئی حل نہیں ہے۔

9 **سرمایہ دارانہ نظام کی بنیاد سود ہے:** جو امتوں کیلئے ناسور کی حیثیت رکھتا ہے۔ جس میں آج تمام دنیا مبتلا ہے۔

10 **سرمایہ دارانہ نظام انسانیت کی طرف محض مادیت کی نظر سے دیکھتا ہے:** اخلاق، حلال و حرام، اچھے برے کا تصور اس نظام میں ناپید ہے۔

11 **سرمایہ دارانہ نظام میں زائد پیداشدہ مال کو محض اس اندیشے سے جلا دیا اور تلف کردیا دریا میں بہا دیا جاتا ہے** کہ کہیں اتنی بڑی مقدار میں مال منڈی میں پہنچنے سے قیمتیں نہ گر جائیں گی۔

12 **سرمایہ دارانہ نظام میں انسان کی بنیادی ضروریات سے صرف نظر کرتے ہوئے سامانِ تعیش زیادہ تیار کیا جاتا ہے** تاکہ منافع زیادہ سے زیادہ حاصل ہو۔ پھر اس کی پبلسٹی پر بے تحاشا سرمایہ صرف کرکے، طرح طرح کی سخن سازیاں کرکے اس کی زبردستی مانگ پیدا کی جاتی ہے۔

اسلامی نظامِ معیشت اور اس کی خصوصیات

گذشتہ سطور میں آپ نے ملاحظہ کیا کہ سرمایہ دارانہ نظام کی تباہی کا اصل سبب اس کے اپنے ہی انسانی عقل کی بنیاد پر تراشیدہ اصول تھے۔ جو کہ تھے بھی خلافِ عقل۔ اب جس مالک نے یہ کائنات بنائی وہ اس کی ضروریات کو انسانوں سے بہتر جانتا ہے

﴿ أَهُمْ يَقْسِمُونَ رَحْمَتَ رَبِّكَ ۚ نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُم مَّعِيشَتَهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ۚ وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُم بَعْضًا سُخْرِيًّا ۗ وَرَحْمَتُ رَبِّكَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُونَ ﴿٣٢﴾ ﴾ الزخرف: ٣٢

ترجمہ: کیا آپ کے رب کی رحمت کو یہ تقسیم کرتے ہیں؟ ہم نے ہی ان کی زندگانی دنیا کی روزی ان میں تقسیم کی ہے اور ایک کو دوسرے سے بلند کیا ہے تاکہ ایک دوسرے کو ماتحت کرلے جسے یہ لوگ سمیٹتے

پھرتے ہیں اس سے آپ کے رب کی رحمت بہت ہی بہتر ہے۔

انسانی علم محدود ہے قَالَ تَعَالَىٰ: ﴿ وَمَآ أُوتِيتُم مِّنَ ٱلْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا ﴿٨٥﴾ ﴾ الإسراء: ٨٥

ترجمہ: اور تمہیں بہت ہی کم علم دیا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے کہ انسانی معیشت مستحکم کن اصولوں پر ہو سکتی ہے۔ رب تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَٱللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ﴿٢١٦﴾ ﴾ البقرة: ٢١٦

ترجمہ: ''اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے''۔

اب اس کے مقابلے میں ذرا اسلامی نظام معیشت و معاشرت کی بنیادوں پر نظر ڈالتے ہیں تا کہ واضح ہو سکے کہ کون سا نظام انسانی معاشرہ کیلئے بہتر اور انسانی مسائل کے حل کیلئے مفید ہے۔ اسلام نے ذاتی منافع کے محرک اور قانون رسد وطلب، کو تسلیم کیا ہے مگر تجارتی و معاشی سرگرمیوں پر چند ایسی پابندیاں عائد کر دی ہیں جن سے معیشت کو غیر متوازن اور دوسری اخلاقی واجتماعی خرابیوں سے محفوظ رکھا جا سکے۔ اس لئے اسلام نے معاشرے میں جو صورتیں معاشرے کیلئے مفید تھیں انہیں باقی رکھا اور جو مضر تھیں وہ سب حرام قرار دے دیں۔ اس سے وہ تمام دروازے بند ہو گئے جن سے معاشرت و معیشت تباہی اور بربادی کے دہانے پر جا سکتی ہے۔ اور پھر چند ایسے اخلاقی اصول وضابطے دے دیئے جن سے معاشرہ کے افراد ایک دوسرے کے دشمن، حریف، ہوس پرست نہیں بلکہ ایک دوسرے کے خیر خواہ بن جاتے ہیں۔

اسلام کی طرف سے بنیادی طور پر ذاتی منافع کے محرک پر تین قسم کی پابندیاں لگائی گئی ہیں۔

❶ شرعی پابندیاں۔

اسلام نے معاشی سرگرمیوں پر حلال و حرام کی کچھ ابدی پابندیاں عائد کی ہیں جو ہر جگہ اور ہر زمانہ میں نافذ العمل ہوں گی۔ مثلا:

① **سود کی حرمت**: فرمان باری تعالیٰ ہے: ﴿ وَأَحَلَّ ٱللَّهُ ٱلْبَيْعَ وَحَرَّمَ ٱلرِّبَوٰاْ ۚ فَمَن جَآءَهُۥ مَوْعِظَةٌ مِّن رَّبِّهِۦ فَٱنتَهَىٰ فَلَهُۥ مَا سَلَفَ وَأَمْرُهُۥٓ إِلَى ٱللَّهِ ۖ وَمَنْ عَادَ فَأُو۟لَٰٓئِكَ أَصْحَٰبُ ٱلنَّارِ ۖ هُمْ فِيهَا خَٰلِدُونَ ﴿٢٧٥﴾ ﴾

ترجمہ: ''حالانکہ اللہ تعالیٰ نے تجارت کو حلال کیا اور سود کو حرام، جو شخص اللہ تعالیٰ کی نصیحت سن کر

رک گیا اس کے لئے وہ ہے جو گزرا اور اس کا معاملہ اللہ تعالیٰ کی طرف ہے اور جو پھر دوبارہ (حرام کی طرف) لوٹا، وہ جہنمی ہے، ایسے لوگ ہمیشہ ہی اس میں رہیں گے"۔

سود سے جو نقصانات معیشت کو ہوتے ہیں وہ بے شمار ہیں ان میں سے چند ایک مندرجہ ذیل ہیں :

☜ سود اخلاقی قدروں کو پامال کرکے خود غرضی، بے رحمی، سنگدلی، زر پرستی اور کنجوسی کی صفات پیدا کرتا ہے ۔ اس لئے باری جل وعلا نے فرمایا: ٱلَّذِينَ يَأْكُلُونَ ٱلرِّبَوٰاْ لَا يَقُومُونَ إِلَّا كَمَا يَقُومُ ٱلَّذِى يَتَخَبَّطُهُ ٱلشَّيْطَٰنُ مِنَ ٱلْمَسِّ ۚ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوٓاْ إِنَّمَا ٱلْبَيْعُ مِثْلُ ٱلرِّبَوٰاْ ۗ

ترجمہ: "سود خور نہ کھڑے ہونگے مگر اسی طرح جس طرح وہ کھڑا ہوتا ہے جسے شیطان چھو کر خبطی بنا دے یہ اس لئے کہ یہ کہا کرتے تھے کہ تجارت بھی تو سود ہی کی طرح ہے"۔

جبکہ اسلام چاہتا ہے کہ معاشرہ رحم وکرم، محبت ومودت، ایثار وتعاون اور بھائی چارے کی بنیاد پر قائم ہو ۔لوگ ایک دوسرے کے معاون ومددگار بنیں۔

☜ سود سے زر اندوزی کی دوڑ شروع ہوجاتی ہے۔ جو انسان کو زر کی حفاظت کیلئے حرام کام پر بھی آمادہ کرتی ہے اور پھر بھائی بھائی کے دست وگریبان ہوتا ہے۔

یہ وہ مفاسد ہیں جو معاشرے کی جڑیں ہلا کر رکھ دیتے ہیں لہذا اسلام نے سود کو حرام قرار دے کر ان تمام نقصانات کا دوازہ بند کردیا۔

② جوے، قمار اور سٹے کی حرمت۔

فرمان باری تعالیٰ ہے : ﴿ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓاْ إِنَّمَا ٱلْخَمْرُ وَٱلْمَيْسِرُ وَٱلْأَنصَابُ وَٱلْأَزْلَٰمُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ ٱلشَّيْطَٰنِ فَٱجْتَنِبُوهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴿٩٠﴾ ﴾ المائدۃ: ٩٠

ترجمہ:" اے ایمان والو! بات یہی ہے کہ شراب اور جوا اور تھان اور فال نکالنے کے پانسے سب گندی باتیں، شیطانی کام ہیں ان سے بالکل الگ رہو تاکہ تم فلاح یاب ہو"۔

اوراس کے نقصانات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: ﴿ إِنَّمَا يُرِيدُ ٱلشَّيْطَٰنُ أَن يُوقِعَ بَيْنَكُمُ ٱلْعَدَٰوَةَ وَٱلْبَغْضَآءَ فِى ٱلْخَمْرِ وَٱلْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَن ذِكْرِ ٱللَّهِ وَعَنِ ٱلصَّلَوٰةِ ۖ فَهَلْ أَنتُم مُّنتَهُونَ ﴿٩١﴾ ﴾ المائدۃ: ٩١

ترجمہ: شیطان تو یوں چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کہ ذریعے سے تمہارے آپس میں عداوت اور بغض

واقع کرادے اور اللہ تعالیٰ کی یاد سے اور نماز سے تمہیں باز رکھے۔ سو اب بھی باز آجاؤ۔

③ آپس میں ناجائز طریقے سے ایک دوسرے کا مال کھانے کی حرمت۔

﴿ يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ لَا تَأْكُلُوٓاْ أَمْوَٰلَكُم بَيْنَكُم بِٱلْبَـٰطِلِ إِلَّآ أَن تَكُونَ تِجَـٰرَةً عَن تَرَاضٍ مِّنكُمْ ۚ وَلَا تَقْتُلُوٓاْ أَنفُسَكُمْ ۚ إِنَّ ٱللَّهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيمًا ﴿٢٩﴾ ﴾النساء: ٢٩

ترجمہ: ”اے ایمان والو! اپنے آپس کے مال ناجائز طریقہ سے مت کھاؤ مگر یہ کہ تمہاری آپس کی رضامندی سے ہو خرید و فروخت اور اپنے آپ کو قتل نہ کرو یقیناً اللہ تعالیٰ تم پر نہایت مہربان ہے“۔

اس ممانعت میں ناجائز طریقے سے مال حاصل کرنے کے تمام ذرائع شامل ہیں چونکہ اسلامی ہدایات سراسر معاشرے کے مفاد میں ہیں۔ جن کو نظر انداز کرنے سے معاشی بگاڑ پیدا ہونا یقینی امر ہے، اس لیے مسلم معاشرے میں ان لوگوں کو کاروبار کی قطعی اجازت نہیں جو تجارت کے متعلق اسلامی احکام سے ناواقف ہوں، چنانچہ خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا فرمان ہے: " لا يبع في سوقنا الّا من تفقه في الدين"۔[1] ”ہمارے بازاروں میں وہی خرید و فروخت کرے جسے دین کی سمجھ ہو“۔

یعنی خرید و فروخت کے متعلق دینی احکام سے آگاہ ہو۔[2]

④ ذخیرہ اندوزی۔

عن معمر بن عبد الله قال سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: لا يحتكر إلا خاطئ مرتين .[3]

آپ ﷺ نے دو بار فرمایا: ”ذخیرہ اندوزی صرف گنہگار شخص ہی کرے گا“۔

مگر سرمایہ دار ملکوں میں سود، قمار، سٹہ اور ذخیرہ اندوزی پر کوئی پابندی نہیں جبکہ یہ چیزیں معاشی ناہمواری کا سب سے بڑا سبب ہیں۔

اسلام میں یہ پابندیاں قرآن و سنت کے ذریعہ لگائی گئی ہیں انہیں انسانی عقل پر نہیں چھوڑا کہ اگر وہ مناسب سمجھے تو عائد کرلے اور اگر مناسب نہ سمجھے تو نہ عائد کرے۔ اس لئے کہ کسی چیز کی اچھائی یا برائی

---

[1] الجامع الترمذی : ابواب الوتر ، باب ماجاء فی فضل الصلاۃ علی النبی

[2] دورِ حاضر کے مالی معاملات کا شرعی حکم، از حافظ ذوالفقار علی طاہر

[3] صحيح مسلم : كتاب المساقات , باب تحريم الإحتكار في الأقوات .سنن الدارمي كتاب البيوع باب في النهي عن الاحتكار

کا فیصلہ کرنے کیلئے بسا اوقات انسانی عقلوں میں تفاوت اور اختلاف ہوتا ہے۔ ایک عقل کسی چیز کو اچھا اور دوسری عقل اسی چیز کو برا سمجھ رہی ہوتی ہے اس لئے اللہ تعالیٰ نے حلّت و حرمت کا معاملہ انسانی عقل پر نہیں بلکہ شریعت کے سپرد رکھا ہے اور وحی کے ذریعے اسے ابدی حیثیت دے دی گئی ہے تاکہ انسان اپنی عقلی تاویلات کے سہارے ان سے چھٹکارا حاصل کرکے معیشت اور معاشرے کو ناہمواریوں میں مبتلا نہ کرسکے۔

2 ریاستی پابندیاں

اسلام نے حکومتِ وقت کو یہ اختیار دیا ہے کہ وہ کسی عمومی مصلحت کے تحت ایسی چیز یا ایسے فعل پر پابندی عائد کرسکتی ہے جو بذات خود حرام نہیں مگر اس سے اجتماعی خرابی یا نقصان لازم آتا ہے۔ یہ پابندی ابدی نوعیت کی نہیں جو کہ ہر زمانہ اور ہر جگہ نافذ العمل ہو بلکہ اس کی حیثیت وقتی ہوتی ہے جو کہ وقتی مصلحت کے تابع ہوتی ہے۔ اور حکومت کی جانب سے لگائی جانے والی اس پابندی کی پیروی کرنا ضروری ہوتا ہے اور حاکم وقت کے احکام شرعا واجب التعمیل ہوتے ہیں۔ فرمان باری تعالیٰ ہے: ﴿ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓاْ أَطِيعُواْ ٱللَّهَ وَأَطِيعُواْ ٱلرَّسُولَ وَأُوْلِي ٱلۡأَمۡرِ مِنكُمۡۖ فَإِن تَنَٰزَعۡتُمۡ فِي شَيۡءٖ فَرُدُّوهُ إِلَى ٱللَّهِ وَٱلرَّسُولِ إِن كُنتُمۡ تُؤۡمِنُونَ بِٱللَّهِ وَٱلۡيَوۡمِ ٱلۡأٓخِرِۚ ذَٰلِكَ خَيۡرٞ وَأَحۡسَنُ تَأۡوِيلًا ﴿٥٩﴾ ﴾ النساء: ٥٩

ترجمہ: "اے ایمان والو! فرمانبرداری کرو اللہ تعالٰی کی اور فرمانبرداری کرو (رسول اللہ ﷺ) کی اور تم میں سے اختیار والوں کی۔ پھر اگر کسی چیز پر اختلاف کرو تو اسے لوٹاؤ، اللہ تعالیٰ کی طرف اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف، اگر تمہیں اللہ تعالیٰ پر اور قیامت کے دن پر ایمان ہے یہ بہت بہتر ہے اور باعتبار انجام کے بہت اچھا ہے"۔

اس اصول کے تحت حکومت وقت تمام معاشی سرگرمیوں کی نگرانی کا حق رکھتی ہے اور جہاں اجتماعی خرابی ونقصان کا اندیشہ ہو وہاں دخل اندازی کرکے اس پر مناسب پابندی عائد کرسکتی ہے۔ مگر یہاں حکومت کو بھی مطلق العنان نہیں چھوڑا گیا بلکہ اس اختیار کو کسی قومی واجتماعی مصلحت کے حصول یا پھر کسی اجتماعی وقومی مفسدت کے ازالہ سے مشروط کیا گیا ہے۔

اس لئے فقہی قاعدہ ہے کہ: تصرف الإمام بالرعية منوط بالمصلحة ۔ عوام پر حکومت کے

اختیارات مصلحت کے ساتھ مقید ہوتے ہیں۔

3 اخلاقی پابندیاں

اسلام نے آخرت پر ایمان کو لازم قرار دے کر تمام قسم کی برائیوں کے خاتمہ کو انتہائی آسان بنادیا ہے۔ اور معیشت میں بھی اسلام نے یہی اصول اپنایا ہے۔ انسان کی اصل کامیابی آخرت کی کامیابی قرار دی ہے اور دنیا کو عارضی باور کرایا تاکہ لوگ زیادہ جمع کی حرص میں آخرت سے محروم نہ رہ جائیں۔ اس لئے اسلام میں انفاق کے احکامات، احتکار سے ممانعت اور دولت سے غریبوں اور محتاجین کا حق نہ دینے والوں کے بارے میں سخت وعید ذکر کرکے معاشرہ میں عادلانہ نظام کے نفاذ کو یقینی بنایا گیا ہے۔ لہذا جب آخرت کا تصور انسان کے ذہن میں آتا ہے تو پھر وہ دولت کی طرف محض مادی نظر سے نہیں بلکہ معاشرہ کی بھلائی اور فلاح کی نظر سے دیکھتا ہے۔ اس کا مقصد اپنی تجوری بھرنا نہیں بلکہ معاشرہ کے نادار افراد کا غمخوار بننا انہیں اپنی خوشیوں میں شریک کرنا بن جاتا ہے۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اس عمل سے اس کو آخرت میں زیادہ فائدہ ہو گا۔ آخرت پر ایمان اور جزاء وحساب کے عقیدہ سے انسان ایسے ذرائع سے دولت نہیں کماتا جنہیں اللہ تعالیٰ نے حرام کیا ہے۔ اور نہ ہی لوگوں کی مجبوری کا فائدہ اٹھاتا ہے۔

شریعت اسلامیہ میں خرید وفروخت کے جو بنیادی اصول وقواعد ہیں ان پر نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے۔ یہ احکام عین معاشرہ کی فلاح کیلئے وضع کئے گئے ہیں۔ اس کے پیچھے کسی طمع ولالچ محرک نہیں بلکہ اس رب اللعالمین کی جانب سے عائد کردہ احکامات ہیں جس کے ہاں فضیلت محض صاحبِ تقویٰ کی ہے۔

شریعت اسلامیہ میں خریدوفروخت کے بنیادی قواعد مندرجہ ذیل ہیں:

1. مبیع (یعنی خریدی اور فروخت کی جانے والی چیز) محرم العین (یعنی بنفسہ حرام) نہ ہو۔ جیسا کہ شراب، خنزیر اور بت وغیرہ۔
2. معاملہ ہر قسم کے سود سے پاک ہو۔
3. معاملہ غرر یعنی (دھوکہ دہی) پر مبنی نہ ہو۔

امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "النهي عن بيع الغرر فهو أصل عظيم من أصول كتاب البيوع "[1]

---

[1] شرح نووي على مسلم : كتاب البيوع ، باب بطلان بيع الحصاة

" بیع غرر سے ممانعت کتاب البیوع کے اصول میں سے ایک عظیم اصول ہے "

غرر کی مثال: جیسا کہ مچھلی کو پانی میں فروخت کرنا، پرندے کو ہوا میں فروخت کرنا۔

امام خطابی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: " ہر وہ بیع جس میں مقصود مجہول، نامعلوم اور دائرہ قدرت سے باہر ہو وہ غرر ہے۔ اس کی مثال پانی میں مچھلی، ہوا میں پرندے سمندر میں لؤلؤ (موتی) بھاگے ہوئے غلام، بپھرے ہوئے اونٹ، تھیلی میں بند کپڑے جنہیں دیکھا نہ گیا ہو، یا مقفل کمرے میں غلہ، جانور کا ایسا بچہ جو ابھی پیدا نہ ہوا ہو، درخت کے ایسے پھل جو ابھی وجود میں نہ آئے ہوں۔ اور اس طرح کی دوسری چیزیں جو نامعلوم ہوتی ہیں اور جن کے متعلق یہ علم نہیں ہوتا کہ ہوں یا نہیں تو اس کی خرید و فروخت منع ہے۔ نبی ﷺ نے ایسی خرید و فروخت سے منع فرمایا ہے تاکہ لوگوں کے مال ضائع ہونے سے محفوظ رہیں اور لوگوں کے درمیان جھگڑا پیدا نہ ہو۔ غرر کے ابواب بہت زیادہ ہیں اور ان کا لب لباب یہ ہے کہ جہاں مقصود میں جہالت آجائے وہ غرر ہے۔" [1]

4 معاملہ کسی ایسی شرط پر مبنی نہ ہو جو سود یا غرر کی جانب لے جانے والی ہو۔

الغرض اسلام نے افراد و معاشرہ کو کسب و معاش کے لحاظ سے اتنا آزاد بھی نہیں چھوڑا کہ اس میں ہر فرد شتر بے مہار کی طرح جیسے چاہے اپنی اجارہ داری قائم کرے جیسے چاہے کمائے اور کھائے۔ اس لئے اسلام نے انفرادی آزادی پر چند حدود و قیود متعین کر دی ہیں تاکہ وہ اجتماعی مفاد کے لئے مضر ہونے کے بجائے مثبت طور پر مفید و معاون ہو۔ اسلام نے معاشی حوالے سے چند ایسے شرعی قواعد وضوابط متعین کئے ہیں جو معاشی زندگی کو خراب کرنے والے اسباب کا سدباب کرتے ہیں۔ مگر سرمایہ دارانہ نظام اس قسم کے تمام اصولوں سے عاری ہے۔ پھر معاشرہ محفوظ کیسے رہے گا؟!

بلکہ سرمایہ دارانہ نظام نے تو معاشرہ کو اس مقام پر کھڑا کر دیا کہ بقول ایک عربی شاعر:

القاه في اليم مكتوف الايادي .... وقال له اياك اياك ان تبتل بالماء

ہاتھ باندھ کر سمندر میں پھینک دیا اور پھر اسے کہنے لگا کہ خبردار بھیگنا مت۔



[1] معالم السنن جلد 3 ص 472 (ماخوذ از دور حاضر کے معاملات کا شرعی حکم)

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی اہل بیت سے رشتہ داریاں [1]

فضیلۃ الشیخ عبد اللہ ناصر رحمانی حفظہ اللہ [2]

الحمدللہ رب العالمین والعاقبة للمتقین ولاعدوان إلا علی الظالمین والصلوة والسلام علی أشرف الأنبیاء وسید المرسلین وعلی آله وصحبه وأهل طاعته أجمعین.

امتِ محمدیہ علی صاحبہا ألف ألف تحیۃ کے خصائص ومزایا میں ایک خصوصیت یہ ہے کہ اللہ تعالی نے اسے وسطیت اور اعتدال پر قائم رکھا ہے ، ﴿ وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَٰكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِّتَكُونُوا۟ شُهَدَآءَ عَلَى ٱلنَّاسِ ﴾البقرة: ١٤٣۔

ترجمہ:" اور اسی طرح ہم نے تم کو امت معتدل بنایاہے تاکہ تم لوگوں پر گواہ بنو"۔

وسطیت واعتدال کا یہ پہلو تمام امور میں موجود ہے، خواہ ان کا تعلق عقیدہ سے ہو یا احکام سے۔

مثال کے طور پر انبیاء کرام علیہم السلام کے تعلق سے یہودیوں کے منہج میں جفاء پائی جاتی ہے، قرآن حکیم نے بتلایاہے کہ یہود نے بہت سے انبیاء کی تکذیب کی اور بہت سوں کو قتل تک کردیا!،اس کے برعکس نصاری کے منہج میں انبیاء علیہم السلام سے محبت کا پہلو تو ہے مگر انتہائی غلو کے ساتھ، جیسا کہ انہوں نے عیسی علیہ السلام سے ایسا اظہارِ محبت کیا کہ انہیں اللہ تعالی کے ساتھ الہ مقرر کرلیا۔

اہل اسلام کے منہج میں وسطیت ہے جو یہود کے افراط اور نصاری کی تفریط کے مابین ہے، چنانچہ مسلمان انبیاء کرام علیہم السلام پر ایمان رکھتے ہیں اور کسی غلو کے بغیر ان سے محبت بھی کرتے ہیں۔

احکام کے اندر اسلام کی وسطیت کی مثال یہ ہے کہ یہود اپنی عورتوں کو ایامِ حیض کے دوران اپنے

---

[1] اہل بیت اور صحابہ کرام کے مابین محبت ورشتہ داریوں پر مشتمل علمی وتحقیقی نقشہ جات "المدینہ اسلامک ریسرچ سینٹر" نے الگ سے شائع کئے ہیں، جنہیں حالیہ مجلہ البیان کے ساتھ حاصل کیا جاسکتاہے،اور ہماری ویب سائٹ www.islamfort.com سے ڈاون لوڈ بھی کیا جاسکتاہے۔

[2] فاضل جامعہ امام محمد بن سعود ریاض، جماعت اہلحدیث کے مایہ ناز عالم، شیخ الحدیث، امیر جمعیت اہلحدیث سندھ ،المشرف العام مرکز المدینہ العلمی۔

سے جدا کر دیتے تھے اور ان کا کھانا پینا بھی الگ تھلگ کر دیتے تھے، جبکہ عیسائیوں کے اندر اس حوالے سے اس قدر کوتاہی پائی جاتی تھی کہ وہ دورانِ حیض اپنی بیویوں سے جماع بھی درست قرار دیتے تھے۔

اس معاملے میں ہم مسلمانوں کا منہج وسطیت پر قائم ہے، ہمارے اندر نہ تو وہ افراط ہے جس میں یہود مبتلا تھے اور نہ ہی وہ تفریط جو نصاری کے اندر پائی جاتی تھی۔

جس طرح دینِ اسلام میں دیگر تمام ادیان کے مقابلے میں منہج اعتدال پایا جاتا ہے، اسی طرح اسلام کے اندر جو بہت سی جماعتیں ہیں، ان میں سے جماعتِ حقہ وطائفہ منصورہ اہل السنۃ والجماعۃ (اہل حدیث) وہ جماعت ہے جس کے منہج میں بقیہ جماعتوں کے مقابلے میں وسطیت واعتدال موجود ہے:

مثلاً: اسماء وصفات کے باب میں اہل السنہ کا عقیدہ، جہمیہ کے افراط اور مشبھہ کی تفریط کے مابین ہے، یعنی:

1. جہمیہ نے تشبیہ کے محذور سے بچنے کیلئے اللہ تعالی کے تمام اسماء وصفات کا انکار کر دیا، اسی بناء پر انہیں نفاۃ اور معطلہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔
2. جبکہ مشبھہ نے اللہ تعالی کے اسماء وصفات کو اس طرح مان لیا کہ ہر صفت میں خالق کو مخلوق کے مشابہ قرار دے دیا۔

اس باب میں اہل السنہ کا عقیدہ اعتدال پر قائم ہے، چنانچہ وہ اللہ تعالی کی تمام صفات، جو کہ کتاب وسنت میں مذکور ہیں پر ایمان رکھتے ہیں، کسی تشبیہ یا تمثیل کے بغیر، اہل السنہ کا اثبات بلا تشبیہ ہے اور تنزیہ بلا تعطیل ہے، اور اس تمام عقیدہ کی اساس اللہ تعالی کا یہ فرمان ہے: ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهِۦ شَىْءٌ ۖ وَهُوَ ٱلسَّمِيعُ ٱلْبَصِيرُ ﴿١١﴾﴾ الشوری: ١١۔ ترجمہ: " اس جیسی کوئی چیز نہیں اور وہ دیکھتا اور سنتا ہے"۔

اسی طرح افعال عباد کے تعلق سے اہل السنہ کا منہج اعتدال پر قائم ہے، اس باب میں دو فرقے الحاد کا شکار بنے:

1. ایک جبریہ، جو بندوں کو مجبورِ محض مانتے ہیں اور ہدایت و گمراہی کے تعلق سے ان کے ہر اختیار کی نفی کرتے ہیں۔
2. دوسرے قدریہ، جو اللہ تعالی کے علمِ سابق کی نفی کرتے ہوئے، تقدیر کا انکار کرتے ہیں۔

اہل السنہ کا منہج ان دونوں کے بین بین ہے، وہ ہدایت یا گمراہی کے اختیار کے تعلق سے مخلوق کو اللہ تعالی کی طرف سے مخیر قرار دیتے ہیں، اس کے ساتھ ساتھ مخلوق کو اللہ تعالی کی مشیت کے تابع اور نوشتہ تقدیر کے مطابق چلنے والا قرار دیتے ہیں۔ ان کے اس عقیدے کی اساس اللہ تعالی کا یہ فرمان ہے :

﴿ لِمَن شَآءَ مِنكُمۡ أَن يَسۡتَقِيمَ ﴿٢٨﴾ وَمَا تَشَآءُونَ إِلَّآ أَن يَشَآءَ ٱللَّهُ رَبُّ ٱلۡعَٰلَمِينَ ﴿٢٩﴾ ﴾ التکویر

ترجمہ: " (یعنی) اس کیلئے جو تم میں سے سیدھی چال چلنا چاہے، اور تم کچھ نہیں چاہ سکتے مگر وہی جو اللہ رب العالمین چاہے"۔

پہلی آیت بندے کے اختیار پر دال ہے، جبکہ دوسری آیت میں اللہ تعالی کی مشیئت کا ذکر ہے، جس کا ہر بندہ تابع ہے اور جس کا ہر فیصلہ تقدیر میں مکتوب ہے۔

اسی طرح اہل السنہ والجماعۃ وعدہ اور وعید کے باب میں مرجئہ اور خوارج و معتزلہ کے عقائد میں پائی جانے والی افراط و تفریط سے یکسر بیزار ہیں، اور ان کا منہج اس باب میں بھی وسطیت واعتدال پر قائم ہے۔

آلِ رسول واصحابِ رسول رضی اللہ عنہم سے محبت کے تعلق سے اہل السنۃ والجماعۃ کا منہجِ اعتدال

اس باب میں بھی بہت سے فرقے الحاد وضلالت کا شکار ہوئے، ایک طرف وہ نواصب یا خوارج ہیں ، جن کے دل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آل کے تعلق سے بغض وعداوت سے بھرے ہوئے ہیں، دوسری طرف وہ روافض ہیں جو اہلِ بیت سے محبت تو کرتے ہیں، لیکن ان کی یہ محبت بہت سے غلو پر قائم ہے، وہ غلو جو ہر دور میں الحاد کے پودوں کی آبیاری کرتا رہا، جس سے کتاب وسنت نے بار بار روکا، اللہ تعالی کا فرمان ہے: ﴿ يَٰٓأَهۡلَ ٱلۡكِتَٰبِ لَا تَغۡلُواْ فِي دِينِكُمۡ ﴾ النساء: ١٧١

ترجمہ: "اے اہل کتاب اپنے دین میں غلو نہ کرو"۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے :(إياكم والغلو فإنما أهلك من كان قبلكم الغلو)

"غلو سے بچو! بیشک تم سے پہلے قوموں کو غلو نے ہلاک کیا"۔

روافض اور نواصب کی اس روش میں یہود و نصاری سے تشبہ کا پہلو موجود ہے، یہودی اپنے نبی موسی علیہ السلام پر ایمان رکھتے تھے، مگر نصاری کے نبی عیسی علیہ السلام پر ایمان تو کجا، ان کے خلاف عداوت نصب کئے بیٹھے تھے، یہی روش نصاری کی تھی جو اپنے نبی عیسی علیہ السلام کو مانتے تھے، مگر یہود کے نبی موسی علیہ السلام کو جھٹلاتے

تھے۔

جبکہ اہل اسلام اپنے نبی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی ایمان رکھتے ہیں، یہودیوں کے نبی موسی علیہ السلام پر بھی ایمان رکھتے ہیں اور نصاری کے نبی عیسی علیہ السلام پر بھی ایمان رکھتے ہیں اور یہ ہمارے منہجِ وسطیت واعتدال کی انتہائی روشن اور قوی دلیل ہے۔

اہل السنہ کا منہج اس حوالہ سے بھی انتہائی سدید ہے، چنانچہ نواصب کے دلوں میں اہلِ بیت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف عداوت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی، جبکہ روافض کے دلوں میں اہلِ بیت سے محبت تو موجود ہے، مگر اصحابِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے تعلق سے انتہائی عداوت و نفرت کا پہلو پایا موجود ہے، جس کا اظہار وہ طرح طرح کے سب و شتم سے کرتے ہیں۔

الحمد للہ اہل السنہ والجماعۃ کے منہج میں اہلِ بیت رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی محبت کا عقیدہ موجود ہے اور تمام اصحابِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کا بھی واضح منہج موجود ہے، اور یہ محبت ہر قسم کے غلو سے پاک ہے، بالکل ویسی ہی محبت جیسی اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے چاہی۔

☼ اہل البیت سے مراد: عند الجمہور وہ لوگ ہیں جنہیں زکوۃ دینا حرام ہے۔

ایک قول کے مطابق یہ بنوہاشم ہیں، دوسرے قول کے مطابق یہ بنوہاشم اور بنوعبد المطلب ہیں۔

دوسرا قول زیادہ راجح ہے؛ کیونکہ صحیح بخاری کی ایک حدیث کے مطابق، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنوہاشم اور بنوعبد المطلب کو ایک ہی قرار دیا ہے۔

☼ ازواجِ مطہرات (امہات المؤمنین) بھی اہل البیت میں شامل ہیں، ان کی شمولیت باعتبارِ نسب یا قرابت نہیں، بلکہ باعتبارِ زوجیت ہے، اور ان کیلئے رسول اللہ کی ازواج ہونا، ایک بہت بڑا شرف ہے؛ کیونکہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے شادی کے بندھن سے منسلک ہو کر دنیا و آخرت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویاں ہونے کا شرف حاصل کر چکی ہیں۔

ویسے بھی لفظِ اہل یا آل کے کتاب و سنت میں جو بہت سے استعمالات ہیں، ان میں سے ایک استعمال بیوی کیلئے بھی ہے:

﴿ إِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِأَهْلِهِۦٓ إِنِّيٓ ءَانَسْتُ نَارًا ﴾ النمل: ۷۔ یہاں اھل سے مراد، موسی علیہ السلام کی بیوی ہے۔

اللہ تعالی نے ابراھیم علیہ السلام اور ان کی بیوی کے بارے میں فرمایا:﴿ رَحۡمَتُ ٱللَّهِ وَبَرَكَٰتُهُۥ عَلَيۡكُمۡ أَهۡلَ ٱلۡبَيۡتِۚ إِنَّهُۥ حَمِيدٞ مَّجِيدٞ ﴿٧٣﴾ ﴾ ھود: ۷۳۔

☼ ہم اہل السنہ والجماعۃ تمام اہل البیت رضی اللہ عنہم سے محبت رکھتے ہیں اور تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے بھی؛ کیونکہ اھل البیت سے محبت بھی شرعی نصوص سے ثابت ہے اور صحابہ کرام سے محبت بھی کتاب وسنت سے ثابت ہے۔

چونکہ یہ تفصیل کا مقام نہیں ہے،لہذا ہم اھل البیت سے محبت کی فرضیت کیلئے ایک حدیث کے ذکر پر اکتفاء کرتے ہیں:

"عن زيد بن أرقم رضى الله عنه قال قام رسول الله ﷺ يوما فينا خطيبا بماء يدعى خما، بين مكة والمدينة ، فحمد الله وأثنى عليه، ووعظ وذكر ،ثم قال : أما بعد ،ألا أيها الناس! فإنما أنا بشر يوشك أن يأتى رسول ربى فأجيب، وأنا تارك فيكم ثقلين ؛ أولهما كتاب الله ،فيه الهدى والنور، فخذوا بكتاب الله ،واستمسكوا به، فحث على كتاب الله ورغب فيه، ثم قال: وأهل بيتى، أذكركم الله في أهل بيتي، أذكركم الله في أهل بيتي ، أذكركم الله في أهل بيتي"[1]

زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:"ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ اور مدینہ کے درمیان،پانی کے ایک تالاب، جس کا نام "خم" مذکور ہے، کے پاس کھڑے ہوئے اور خطبہ ارشاد فرمایا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالی کی حمد وثناء بیان فرمائی اور کچھ نصیحتیں ارشاد فرمائیں اور فرمایا: اما بعد: اے لوگو! خبر دار میں ایک بشر ہوں اور عنقریب میرے پاس اللہ تعالی کا قاصد آنے والا ہے، جس پر میں لبیک کہوں گا(پیامِ اجل کی طرف اشارہ ہے)میں تمہارے بیچ" دوبھاری امانتیں"چھوڑے جارہاہوں، ایک کتاب اللہ جو ہدایت ونور سے لبریز ہے،اسے خوب مضبوطی سے تھام لینا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کتاب اللہ کو تھامے رکھنے کی خوب ترغیب دلائی، پھر فرمایا دوسری چیز میرے اہل بیت ہیں، میں تمہیں اپنے اہل بیت کے بارے میں خوب نصیحت کرتاہوں، میں تمہیں اپنے اہل بیت کے بارے میں خوب نصیحت کرتاہوں، میں تمہیں اپنے اہل بیت کے بارے میں خوب نصیحت کرتاہوں"۔

[1] صحيح مسلم (2408)

یہ حدیث اہل بیت کی تکریم کے تعلق سے زبردست وصیت، اور ان کی محبت، توقیر و تعظیم اور حقوق کی ادائیگی کی تاکید پر مشتمل ہے۔

اھل البیت کی تکریم و تعظیم اور تفضیل و تجلیل پر اجتماعی اور انفرادی بہت سے نصوص موجود ہیں، جن سے اہل السنہ کی کتب بھری پڑی ہیں، یہ ان کے استیعاب کا محل نہیں ہے۔

اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تکریم و توقیر اور ان سے وجوبِ محبت:

(عن أبي سعيد الخدري رضي الله عنه قال قال رسول الله ﷺ لاتسبوا أصحابى فلو أن أحدكم أنفق مثل أحد ذهبا مابلغ مد أحدهم ولا نصيفه)[1]

ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "میرے صحابہ میں سے کسی کو اپنی گالی کا نشانہ مت بناؤ؛ تم لوگ اگر اُحد پہاڑ کے برابر سونا خرچ کردو تو ان کے ایک پاؤ کے نفقہ کے اجر کو بھی نہیں پاسکتے۔

یہی حدیث صحیح مسلم میں ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے مروی ہے، جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوبار فرمایا کہ: "میرے صحابہ کو گالی مت دو"، پھر فرمایا: "اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، تم لوگ اگر اُحد پہاڑ کے برابر سونا خرچ کردو تو ان کے ایک پاؤ کے نفقہ کے اجر کو بھی نہیں پاسکتے۔

متعدد طرق سے یہ روایت ثابت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے بہترین زمانہ اپنا اور صحابہ کرام کا زمانہ قرار دیا ہے۔

ان تمام نصوص کا تقاضا یہی ہے کہ ہم آلِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی محبت کریں اور اصحابِ رسول سے بھی۔ قرونِ اولی میں محبت کے یہ تمام مظاہر موجود تھے، جس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اہل بیت اور اصحابِ رسول کے مابین کئی نسلوں تک رشتہ داریاں قائم ہوتی رہیں، باہمی محبت واعتماد اور دین داری کے اثبات کیلئے اس سے بڑا کیا ثبوت ہو سکتا ہے۔

ان رشتوں اور قرابتوں کے اثبات کے بعد صحابہ کرام کی شان میں گستاخی یا تبرا کا کوئی جواز باقی بچتا ہے؟ اسی حوالے سے اہل السنہ اور اہل تشیع کی کتب سے انہی قرابتوں اور رشتے داریوں کا ذکر کیا جاتا ہے اور ان لوگوں کو اپنی روش پر نظر ثانی کی دعوت دی جاتی ہے، جن کے دل صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بغض

[1] صحيح البخاري (3663)

سے لبریز ہو چکے ہیں۔ وباللہ التوفیق

بہت سے لوگ، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور اہلِ بیت اطہار رضی اللہ عنہم کے مابین قائم قرابتوں اور رشتہ داریوں سے ناواقف ہیں، ہم ذیل میں ان بعض قرابتوں کا ذکر کرتے ہیں، شاید کہ وہ لوگ جن کے دل صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بغض سے لبریز ہیں اور اہلِ بیت سے محبت کے دعویدار ہیں ،اپنی روش پر نظرِ ثانی پر مجبور ہو سکیں؛ کیونکہ اہلِ بیت رضی اللہ عنہم کی یہ رشتہ داریاں جن کا تعلق مصاہرت (شادی بیاہ کا تعلق) سے ہے، ان کی صحابہ کرام سے محبت کی واضح دلیل قرار پائیں گی، اور یہ بات معلوم ہے کہ ہم جس سے بھی محبت کا دعوی کریں، اس کی صداقت اور کاملیت تب ہی ثابت ہو گی جب ان سے بھی محبت کریں جن سے اسے محبت ہو۔

اہلِ بیت الاطہار اور آلِ سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے مابین قائم ہونے والی رشتہ داریاں

خلیفہ اول وراشد سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو اہلِ بیت سے جس قدر محبت تھی اس کا اندازہ ان کے اس قول سے لگالیا جائے، آپ رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے: (والذی نفسي بیده ! لقرابة رسول الله ﷺ أحب إلي من أن أصل من قرابتي)

یعنی: قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! رسول اللہ ﷺ کی قرابت داریوں کو جوڑنا مجھے اپنے رشتوں کے جوڑنے سے زیادہ پسند اور محبوب ہے۔[1]

آپ رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے :(إرقبوا محمدا فی أهل بیته) یعنی :"محمد ﷺ کی مبارک صورت دیکھنی ہو تو آپ ﷺ کے اہل بیت کو دیکھ لیا کرو"۔[2]

ایک دن حسن رضی اللہ عنہ اپنے والد علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھے، ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حسن رضی اللہ عنہ کو اپنے ہاتھوں سے اٹھالیا اور انہیں پیار کرتے ہوئے یہ جملہ کہتے رہے :(شبیهاً بالنبي ولیس شبیهاً بعلي) یعنی: یہ تو نبی ﷺ کے ہم شکل ہیں، اپنے والد علی کے نہیں سیدنا علی رضی اللہ عنہ یہ سن کر مسکراتے رہے۔[3]

سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے اہلِ بیت اطہار سے قوی تعلق و قرابت، امام جعفر صادق رحمۃ اللہ علیہ کے اس

---

[1] صحیح البخاري ، کتاب المناقب (3712)
[2] صحیح البخاري ، کتاب المناقب (3713)
[3] مسند أحمد (39)

قول سے عیاں ہے: "ولدني أبو بكر مرتين" یعنی: مجھے ابو بکر رضی اللہ عنہ نے دو بار پیدا کیا ہے۔

ان کے اس قول کا سبب یہ ہے کہ امام جعفر صادق رحمۃ اللہ علیہ کا والد کی طرف سے نسب یوں ہے: جعفر الصادق بن محمد بن علی بن الحسین بن علی بن ابی طالب، اور والدہ کی طرف سے ان کے نسب کی تفصیل یہ ہے کہ ان کی والدہ ام فروہ، قاسم بن محمد بن ابی بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بیٹی ہیں، جبکہ ام فروہ کی والدہ اسماء بنت عبد الرحمن بن ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں، تو گویا امام جعفر صادق کی والدہ ام فروہ کا نسب والد کی طرف سے ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ہے اور والدہ کی طرف سے بھی ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ہے۔ اسی لئے امام جعفر صادق رحمۃ اللہ علیہ نے یہ بات کہی کہ "مجھے ابو بکر نے دو بار پیدا کیا ہے"۔

امام جعفر صادق کے اس قول کے اسلوب پر غور کیجئے، کس قدر فخر اور تحدیثِ نعمت کا انداز نمایاں ہو رہا ہے، اور ظاہر ہے ایک صالح اور متقی انسان، ہر اس تعلق داری پر اظہارِ مسرت اور اظہارِ فخر کرتا رہے گا جو اسے صالحین اور متقین اسلاف کی لڑی سے منسلک کر دے، امام جعفر رحمۃ اللہ علیہ کو ان کے ہمیشہ ہمیشہ کے صدقِ مقال کی وجہ سے صادق کے لقب سے ملقب کیا گیا، اور وہ اپنے جس دادا (ابو بکر رضی اللہ عنہ) سے اپنے دہرے تعلق کا فخریہ انداز سے اظہار فرمایا کرتے تھے، وہ دربارِ نبوت سے "صدیق" جیسے عظیم لقب سے ملقب ہوئے، اور یہ لقب انہیں، ان کی صداقت، امانت اور ہر مرحلہ پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر ہر فرمان کی تصدیق پر حاصل ہوا۔

اور امام جعفر صادق رحمۃ اللہ علیہ کو "عمود الشرف" کا لقب بھی حاصل ہے، جس کا معنی یہ ہے کہ انہیں باعتبارِ نسب انتہائی قوی قسم کا شرف عطا ہوا ہے، چنانچہ اپنے والد کی طرف سے ہاشمی ٹھہرے اور اپنی والدہ کی طرف سے ان کا تعلق آلِ صدیق سے قائم ہوا۔

سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اور سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے مابین انتہائی قوی رشتے قائم تھے۔

1. سب سے زیادہ وثیق، قوی اور مبارک رشتہ یہ قائم ہوا کہ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بیٹی سیدہ عائشہ صدیقہ طاہرہ مطہرہ رضی اللہ عنہا سے سید الاولین والآخرین جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نکاح کیا، اور انہیں بنصِ قرآنی ام المؤمنین ہونے کا شرف حاصل ہوا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عقد میں یہ واحد باکرہ خاتون تھیں، اِن سے نکاح سے قبل متعدد بار آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خواب میں دیکھا کہ جبریل امین سیدہ

عائشہ صدیقہ کو ایک ریشمی غلاف میں لپیٹ کر لائے اور ان کا چہرہ دکھا کر فرمایا: "إنها زوجتك في الدنيا والآخرة" "یہ دنیا میں اور قیامت کے دن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیوی ہیں"۔جب ایک بار عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ:" آپ کو سب سے زیادہ محبت کس سے ہے ؟ تو فرمایا: عائشہ سے، پوچھا: مردوں میں سے کس سے ہے؟ فرمایا: عائشہ کے والد سے"[1]۔

2. سیدنا جعفر بن ابی طالب الطیار رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد، ان کی بیوہ سیدہ اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا (علی رضی اللہ عنہ کی بھابھی) کو سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے نکاح میں لے لیا تھا، اور ان سے ان کا بیٹا محمد بن ابی بکر پیدا ہوا۔

3. سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے انتقال کے بعد انہی اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا سے سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے نکاح کر لیا، اسماء کے ساتھ ان کا بیٹا محمد بن ابی بکر بھی تھا، جسے علی رضی اللہ عنہ کے ربیب ہونے کا شرف حاصل ہوا، گویا سیدنا حسن وحسین رضی اللہ عنہما کے ساتھ ساتھ ان کی بھی پرورش ہوئی، جنابِ علی رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے : "هو ابني من ظهر أبي بكر" یہ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی پشت سے ہے لیکن میرا بیٹا ہے" جناب علی رضی اللہ عنہ کی ان سے محبت اور حسنِ اعتماد کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ انہوں نے انہیں مصر کی گورنری تفویض فرمائی تھی۔

4. تاریخ کی شہادت سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ امیر المؤمنین عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں جب فارس فتح ہوا تو فارس کے حکمران یزدجر بن شہریان کی دو بیٹیوں کو گرفتار کرکے دارالخلافہ مدینہ منورہ پہنچا دیا گیا، یہ دونوں خواتین راستے میں اسلام قبول کر چکی تھیں، جس وقت یہ دونوں امیر المؤمنین کے پاس پہنچیں، اس وقت بہت سے صحابہ آپ کے ارد گرد تشریف فرما تھے، امیر المؤمنین نے اس موقع پر اپنا مشہور قول ارشاد فرمایا:"بنات كرام من أصول كرام لا يستحقهن إلا الكرام " یعنی:" یہ معزز بیٹیاں ، معزز نسب سے تعلق رکھتی ہیں، انتہائی معزز لوگ ہی ان کے حق دار ہوسکتے ہیں"، یہ بات امیر المؤمنین نے جناب علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی

---

[1] صحيح البخاري (3662)

طرف دیکھ کر فرمائی تھی، پھر ان دونوں خواتین کو ان کے حوالے کر دیا، (گویا امیر المؤمنین عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ جنابِ علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ اور ان کے اہل کو انتہائی معزز شمار کرتے تھے)، سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے ان میں سے ایک خاتون کو اپنے بیٹے حسین رضی اللہ عنہ کے سپرد کر دیا، جبکہ دوسری اپنے ربیب یعنی ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے بیٹے محمد کے حوالے، پھر ان دونوں خواتین سے ان کا باقاعدہ نکاح کر دیا گیا، (گویا جنابِ علی رضی اللہ عنہ سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اور ان کے اہل وعیال کو انتہائی معزز قرار دیتے تھے، جبھی تو ان میں سے ایک خاتون، محمد بن ابی بکر کے حوالے کر دی تھی) جو خاتون حسین رضی اللہ عنہ کے نکاح میں آئی، اس سے امام زین العابدین رحمۃ اللہ علیہ پیدا ہوئے، جبکہ محمد بن ابی بکر رحمۃ اللہ علیہ کے عقد میں آنے والی خاتون کے بطن سے قاسم بن محمد رحمۃ اللہ علیہ نے جنم لیا، یوں یہ دونوں خالہ زاد بھائی ہوئے۔

5. آگے چل کر حسین رضی اللہ عنہ کے پوتے محمد کا، محمد بن ابی بکر کی پوتی، ام فروہ سے نکاح ہوا، جن سے امام جعفر الصادق رحمۃ اللہ علیہ پیدا ہوئے؟ یہاں پہنچ کر ایک انتہائی ٹھوس اور ناقابلِ انکار تاریخی شہادت ہمارے سامنے واضح ہوتی ہے، اور وہ یہ کہ امام جعفر الصادق رحمۃ اللہ علیہ کی والدہ ام فروہ کے والد کی طرف سے دادا محمد بن ابی بکر ہیں اور ماں کی طرف سے ان کے دادا عبد الرحمن بن ابی بکر ہیں، اور محمد اور عبد الرحمن دونوں سیدنا عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے سگے بھائی تھے، اس طرح ام المؤمنین سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے امام جعفر صادق کا خونی رشتہ ثابت ہوا۔

اس خونی رشتہ سے بڑھ کر، ایک اور رشتہ ثابت ہوتا ہے، اور وہ تعلمِ علم جیسا عظیم اور مقدس رشتہ ہے، چنانچہ امام جعفر الصادق رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے علم کا بہت ساحصہ جناب عروہ بن زبیر رحمۃ اللہ علیہ سے حاصل کیا تھا اور عروہ بن زبیر، سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے ملازم شاگردوں میں شمار ہوتے ہیں، یوں امام جعفر صادق کا ام المؤمنین سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے انتہائی قوی اور وثیق تعلق ثابت ہوا۔(رضی اللہ عنہم اجمعین)

ہم ملخصاً اُن قرابتوں اور رشتوں کا ذکر کئے دیتے ہیں جو آلِ بیت النبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آل ابی بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے مابین قائم ہوئے:

1. محمد بن عبد اللہ، رسول اللہ ﷺ نے ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بیٹی سیدہ عائشہ صدیقہ ام المؤمنین رضی اللہ عنہا سے نکاح کیا۔
2. حسن بن علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے بیٹے عبد الرحمن کی بیٹی حفصہ سے نکاح کیا۔
3. اسحاق بن جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پوتے قاسم بن محمد رحمۃ اللہ علیہ کی بیٹی ام حکیم سے نکاح کیا۔
4. محمد الباقر بن علی زین العابدین بن حسین بن علی بن ابی طالب رحمۃ اللہ علیہ نے ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پوتے قاسم بن محمد کی بیٹی ام فروہ سے نکاح کیا۔
5. موسی الجون بن عبد اللہ المحض بن الحسن المثنی بن الحسن السبط بن امیر المؤمنین علی بن ابی طالب نے ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پوتے عبد اللہ بن عبد الرحمن کی پڑپوتی ام سلمہ بنت محمد بن طلحہ بن عبد اللہ سے نکاح کیا۔
6. اسحق بن عبد اللہ بن علی بن الحسین بن علی بن ابی طالب نے کلثوم بنت اسماعیل بن عبد الرحمن بن قاسم بن محمد بن ابو بکر صدیق سے نکاح کیا۔

آلِ بیت کے آلِ صدیق سے ان چھ رشتوں میں ایک بات انتہائی قابلِ غور ہے، اور وہ یہ ہے کہ ان تمام رشتوں میں خاوند، آلِ بیت سے ہوا اور بیوی الِ صدیق سے، اور عموماً شادی کا پیغام لڑکے کی طرف سے جاتا ہے، چنانچہ شوہر اپنے نکاح کیلئے نیک بیوی کا انتخاب کر کے پیغامِ نکاح بھیجتا ہے، تو گویا مذکورہ چھ قرابتوں میں آلِ بیت کی طرف سے آلِ ابی بکر میں سے رشتے طلب کئے گئے، یہ طلب اس بات کی دلیل ہے کہ آلِ بیت الاطہار، کس قدر سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اور ان کے خاندان سے محبت کرتے تھے، نیز ان کے قوی دین اور تقوی کے معترف تھے؛ کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے دین دار خاتون سے نکاح کی ترغیب دی ہے،

عن أبي هريرة رضی اللہ عنہ قال قال رسول الله: " تنكح المرأة لأربع: لمالها ولحسبها ولجمالها ولدينها فاظفربذات الدين تربت يداک".

ابو ھریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”عورت سے چار امور کی وجہ

سے نکاح کیا جاتا ہے: اس کے مال کی وجہ سے اس کے حسب ونسب کی وجہ سے اس کے حسن وجمال کی وجہ سے اور اس کے دین کی وجہ سے، تم دین دار عورت کو ترجیح دو"۔ [1]

اسی طرح عورت کے اولیاء الامور کو ہدایت ہے کہ جب ان کی بیٹی کا کوئی دین دار رشتہ آجائے تو وہ انکار نہ کریں: "إذا جاءكم من ترضون دينه وخلقه..." الحديث

یعنی: "جب تمہاری بیٹی کا ایسا رشتہ آجائے جس کا دین اور اخلاق پسندیدہ ہو تو اسے قبول کرلو، ورنہ فسادِ کبیر کا اندیشہ ہے۔ [2]

ان احادیث سے یہ بات عیاں ہوگئی کہ آلِ بیت سے مختلف افراد کا، اپنے نکاح کیلئے آلِ ابی بکر صدیق کی خواتین کا انتخاب، اس بات کی دلیل ہے کہ وہ ان کے دین اور تقوی کے معترف تھے، اور آلِ ابی بکر کا ان تمام رشتوں کو قبول کرنا اس بات کا بین ثبوت ہے کہ وہ بھی آلِ بیت کے دین، تقوی اور حسنِ خلق کے معترف تھے، ان پاکیزہ رشتوں اور قرابتوں پر اللہ تعالی کا یہ فرمان پوری طرح منطبق ہورہا ہے: ﴿وَٱلطَّيِّبَٰتُ لِلطَّيِّبِينَ وَٱلطَّيِّبُونَ لِلطَّيِّبَٰتِ﴾ النور: ٢٦۔ترجمہ:" اور پاک عورتیں پاک مردوں کے لئے ہیں اور پاک مرد پاک عورتوں کے لئے"۔

ایک امرِ ملحوظ یہ بھی ہے کہ ان میں سے بیشتر رشتے اُن حوادث کے بعد معرضِ وجود میں آئے جن حوادث کو بعد میں آنے والے لوگوں نے اپنی اھوائے فاسدہ کی بناء پر آپس کے بگاڑ کا سبب قرار دے ڈالا، بلکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر سب وشتم اور طعنہ زنی کے دروازے کھول ڈالے، مثلاً: قضیہ فدک، جنگِ جمل، جنگ صفین اور واقعہ کربلا۔ واللہ المستعان

افسوس! صحابہ کرام اور بالخصوص شیخین کریمین پر طعنہ زنی کے یہ دروازے آج تک کھلے پڑے ہیں، ذرا سا توقف اور تأمل ہی کرلیا جائے کہ آلِ علی بن ابی طالب کی آلِ ابی بکر صدیق سے یہ تمام رشتہ داریاں کس میزان میں رکھی جائیں گی۔

اہلِ بیت الاطہار اور آلِ سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے مابین قائم ہونے والی رشتہ داریاں

[1] صحيح البخاري (5090)

[2] الجامع الترمذي (1084)

امیر المؤمنین سیدنا عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ جن کے محاسن ومحامد لاتعداد ہیں، جنہیں دربارِ نبوت سے ''الفاروق'' کے لقب سے نوازا گیا، جن کے اسلام نے حق وباطل میں فرق وامتیاز کی ایک انمٹ لکیر کھینچ دی، جن کا اسلام بھی اعلانیہ تھا اور ہجرت بھی۔

جن کے اسلام قبول کرنے نے، دینِ اسلام کی عزت ووقار اور شان وحشمت کو چار چاند لگا دیئے ، جنہوں نے تقریباً آدھی دنیا پر اسلام کا پرچم لہرا دیا، سلطنتِ فارس وروم میں کسری اور قیصر کی کمر توڑ دی، جن کا دورِ خلافت اس کرہ ارضی سے کفر وضلال اور طاغوت ووثنیت کے مٹنے اور توحید وسنت کے قائم ہونے نیز نظامِ عدل کے استوار ہونے کا ذریعہ ثابت ہوا؟

جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے انتہائی محبوبین ومقربین میں شمار ہوا کرتے تھے، جو زبانِ نبوت سے متعدد بار جنت کی بشارت جیسے عظیم مقام ومرتبہ کے مستحق قرار پائے۔

﴿پہلا رشتہ﴾ ان تمام زریں کارناموں اور روشن بشارتوں کے ساتھ ساتھ انہیں ایک فضیلت ومنقبت یہ حاصل ہوئی کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے صدق واخلاص اور نصرتِ دین کو ملاحظہ فرمایا تو ان سے ان کی بیٹی حفصہ رضی اللہ عنہا کو اپنے نکاح کیلئے طلب فرمایا، اور یہ اس وقت ہوا جب حفصہ رضی اللہ عنہا کے پہلے شوہر جنگ بدر میں شہادت کے رتبہ پر فائز ہوئے۔

گویا حفصہ رضی اللہ عنہا کتنی بابرکت خاتون ہیں کہ ان کا پہلا شوہر جب شہیدِ معرکہ بدر ہوا تو اللہ تعالی نے نعم البدل کے طور پر انہیں اکرم الخلائق، سیدِ اولادِ آدم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجیت کے شرف سے مشرف فرمادیا۔

یہ وہ پہلا رشتہ ہے جو بیت نبوت اور آلِ عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے مابین قائم ہوا۔

﴿دوسرا رشتہ﴾ دوسرا رشتہ جو آلِ بیت الاطہار اور سیدنا عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے گھرانے کے مابین قائم ہوا وہ امیر المؤمنین سیدنا عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کا سیدنا علی بن ابی طالب اور سیدہ فاطمۃ الزھراء رضی اللہ عنہا کی بیٹی ام کلثوم سے نکاح تھا۔

یہ رشتہ خود امیر المؤمنین عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے طلب فرمایا تھا، جب جناب علی رضی اللہ عنہ نے اس رشتہ سے موافقت فرمالی تو امیر عمر رضی اللہ عنہ انتہائی خوش ہو کر صحابہ کرام کے پاس

آئے اور فرمایا: تم مجھے مبارک باد کیوں نہیں دیتے؟ صحابہ نے پوچھا: امیر المؤمنین! کس بات کی؟ فرمایا: علی اور فاطمہ کی بیٹی ام کلثوم سے نکاح کی، مزید فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ حدیث سنی ہوئی ہے "كل نسب وسبب ينقطع يوم القيامة إلا سببي ونسبي" یعنی: "قیامت کے دن ہر نسب و قرابت ٹوٹ جائے گی، سوائے میرے نسب اور قرابت کے"، چنانچہ اس رشتہ کے ذریعے میرے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مابین رشتہ قائم ہو چکا ہے۔

اس بابرکت نکاح سے امیر المؤمنین عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے بیٹے زید بن عمر پیدا ہوئے، اور جناب زید بن عمر انتہائی فخریہ انداز سے یہ فرمایا کرتے تھے: "انا ابن الخليفتين" یعنی: "میں دو خلیفوں کا بیٹا ہوں"، ان کا اشارہ دو خلفاء راشدین رضی اللہ عنہما کی طرف ہے، ایک سیدنا عمر دوسرے سیدنا علی رضی اللہ عنہما۔

یہ زید بن عمر اور ان کی والدہ ام کلثوم بنت علی ایک ہی حادثہ میں بوقت فجر رتبہ شہادت سے مشرف ہوئے۔

ام کلثوم بنت علی رضی اللہ عنہا بعض اوقات فرمایا کرتی تھیں: "مالي ولصلاة الغداة" یعنی: "فجر کی نماز کے ساتھ میرے کچھ رنج والم سے بھری یادیں وابستہ ہیں"، ان کا اشارہ دو واقعات کی طرف ہے:

1. ان کے شوہر امیر المؤمنین عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کی شہادت۔
2. ان کے والد امیر المؤمنین علی المرتضی رضی اللہ عنہ کی شہادت۔

جبکہ وہ خود بھی اپنے بیٹے زید بن عمر کے ساتھ بوقت فجر ہی شہادت کے رتبہ پر فائز ہوئیں۔

﴿ تیسرا رشتہ ﴾ آلِ بیت الاطہار اور آلِ عمر بن الخطاب کے مابین قائم ہونے والی تیسری مصاہرت اس طرح قائم ہوئی کہ جناب حسین بن علی بن علی بن حسین بن علی بن ابی طالب کا نکاح سیدہ جویریہ بنت خالد بن ابی بکر بن عبد اللہ بن عمر بن الخطاب سے عمل میں آیا، گویا جناب حسین بن علی کے پوتے کے پوتے کا نکاح جناب عمر بن الخطاب کے پوتے کی پوتی سے منعقد ہوا۔

صدق اللہ تعالی: ﴿ وَٱلطَّيِّبَٰتُ لِلطَّيِّبِينَ وَٱلطَّيِّبُونَ لِلطَّيِّبَٰتِ ﴾ النور: ٢٦۔ ترجمہ: " اور پاک عورتیں پاک مردوں کے لئے ہیں اور پاک مرد پاک عورتوں کے لئے"۔

اہلِ بیت الاطہار اور آلِ سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے مابین قائم ہونے والی رشتہ داریاں

امیر المؤمنین سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ جو خلفاء راشدین میں سے تیسرے خلیفہ راشد ہیں، جن کا شمار سابقین اولین صحابہ کرام میں ہوتا ہے، جو ان دس صحابہ کی فہرست میں شامل ہیں جنہیں دنیا میں جنت کی بشارت دی گئی، جنہیں تاریخ منبع جود وسخا جیسے عظیم وصف سے جانتی اور پہچانتی ہے، جو ایسے پیکرِ شرم وحیاء تھے کہ جن کی حیاء کا فرشتے بھی احترام کرتے تھے، جنہوں نے بئرِ رومہ نامی کنواں اپنی جیب خاص سے خرید کر مسلمانوں کیلئے وقف کر دیا، جیشِ عسرہ کی تجہیز میں سب سے نمایاں تعاون آپ ہی کا تھا۔

اللہ تعالی نے آپ کو ہجرتِ مدینہ سے قبل ہجرتِ حبشہ کی توفیقِ عظیم مرحمت فرمائی، اسی لئے آپ کو تاریخ "صاحب الھجرتین" کے لقب سے یاد کرتی ہے، آپ ہی کی وجہ سے بیعتِ رضوان منعقد ہوئی ، جس کی برکت سے تمام بیعت کرنے والوں سے اللہ تعالی نے اپنی رضا کا اعلان فرمادیا، نیز ان کے قلوب میں مستقر ان کے ایمان کی صداقت کی گواہی دے دی اور بطورِ صلہ فتح قریب یعنی خیبر ان کی جھولی میں ڈال دیا، جس کے بعد مسلمانوں کا فقر ختم ہوا اور انہیں پیٹ بھر کے کھانا نصیب ہوا۔

ایک ایسی سعادت ان کے حصہ میں آئی کہ ہمارے ناقص علم کے مطابق، اولین وآخرین میں سے کسی کو وہ سعادت نصیب نہیں ہوئی، اور وہ یہ کہ سید الاولین والآخرین جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی یکے بعد دوبیٹیاں آپ رضی اللہ عنہ کے حبالہ نکاح میں آئیں، کسی نبی کے کسی امتی کو یہ سعادت نصیب نہیں ہوسکی۔

اسی لئے سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو ذوالنورین کے عظیم لقب سے ملقب کیا گیا، جبکہ اپنی دوسری صاحبزادی کے انتقال کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ: "اگر میری اور بیٹی ہوتی تو وہ بھی عثمان کے نکاح میں دے دیتا"۔

اس ناطے سے امیر المؤمنین علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ، سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے ہم زلف ٹھہرے اور تاریخ شاہد ہے کہ سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے اپنے ہم زلف سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی فاطمہ الزھراء رضی اللہ عنہا کی شادی میں مکمل تعاون فرمایا تھا، جس کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب علم ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت ساری دعائیں دی تھیں۔

سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا خاندانِ نبوت سے یہ پہلا تعلق نہیں ہے، بلکہ وہ باعتبارِ نسب اپنے والد اور والدہ

دونوں کے توسط سے رسول اللہ ﷺ کے مبارک نسب سے ملتے ہیں۔

باپ کی طرف سے سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا نسب یوں ہے: عثمان بن عفان بن ابی العاص بن امیہ بن عبد شمس بن عبد مناف... گویا عثمان غنی کا نسب رسول اللہ ﷺ کے دادا عبد مناف سے جاملتا ہے۔

والدہ کی طرف سے آپ کا نسب اس طرح ہے کہ آپ کی والدہ بیضاء، عبد المطلب کی سگی بیٹی ہیں، گویا عثمان غنی کی والدہ بیضاء اور رسول اللہ ﷺ کے والد عبد اللہ آپس میں سگے بہن بھائی ہیں، بلکہ بیضاء، عبد اللہ کی جڑواں بہن ہیں، یعنی دونوں نے ایک ہی پیٹ میں پرورش پائی اور اکٹھے دنیا میں جنم لیا۔

﴿ پہلا رشتہ ﴾ پہلے عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا نکاح رسول اللہ ﷺ کی بیٹی رقیہ رضی اللہ عنہا سے ہوا، جو دونوں ہجرتوں میں عثمان غنی کے ہمراہ تھیں، ہجرت مدینہ کے کچھ عرصہ بعد بیمار ہوگئیں، جن کی تیمارداری کا شرف عثمان غنی کو حاصل ہوا، حتی کہ غزوۂ بدر کے دوران بھی نبی ﷺ کے حکم سے ان کی تیمارداری میں مشغول رہے۔

﴿ دوسرا رشتہ ﴾ ان کے انتقال کے بعد، رسول اللہ ﷺ نے ان کی بہن ام کلثوم رضی اللہ عنہا عثمان رضی اللہ عنہ کے نکاح میں دے دی، جو ان کے ساتھ ساتھ رہیں اور ۹ ھ میں انتقال فرماگئیں، اس طرح سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو نبی ﷺ کی دو بیٹیوں کا شوہر ہونے کا شرف حاصل ہوا۔

معاملہ یہیں موقوف نہیں ہوتا، بلکہ آلِ رسول ﷺ اور آلِ عثمان (بنو امیہ) کے مابین متعدد رشتہ داریاں قائم ہوئیں، جس کا سلسلہ پانچ نسلوں تک پھیلا ہوا ہے، چنانچہ بنو امیہ یعنی آلِ عثمان کی سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کے خاندان میں دو اور سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے خاندان میں تین شادیاں ہوئیں، جو ان کی آپس کی محبت، حسنِ اعتماد اور ایمان، تقوی اور خلقِ حسن کے اعتراف کا انتہائی واضح اور بین ثبوت ہے، یہ رشتہ داریاں ملخصًا حسب ذیل ہیں:

1. عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے بیٹے ابان بن عثمان کا نکاح عبد اللہ بن جعفر بن ابی طالب کی بیٹی ام کلثوم سے ہوا۔
2. عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے پوتے زید بن عمرو بن عثمان کا نکاح، سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی پوتی اور سیدنا حسین بن علی رضی اللہ عنہ کی بیٹی سکینہ سے ہوا۔

3. سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے ایک اور پوتے محمد بن عبد اللہ بن عمرو بن عثمان کا نکاح، سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کی دوسری بیٹی فاطمہ سے ہوا۔

4. سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے پوتے مروان بن ابان کا نکاح سیدنا حسن بن علی رضی اللہ عنہ کی پوتی ام القاسم بنت حسن المثنی سے ہوا۔

5. حسن المثنی کے پوتے ابراہیم بن عبد اللہ نے عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے پوتے عبد اللہ بن عمرو کی پوتی رقیہ بنت محمد سے نکاح کیا۔

6. سیدنا زین العابدین بن حسین رحمۃ اللہ علیہ کے پوتے اسحق بن عبد اللہ نے سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے پوتے عاصم کی پوتی عائشہ بنت عمر سے نکاح کیا۔

عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا تعلق بنو امیہ سے تھا، بنو امیہ کے دیگر بہت سے افراد کی ،خاندانِ نبوت سے رشتہ داریاں قائم ہوئی ہیں جو تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہیں۔ (جاری ہے)



صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں اہل السنہ کے اجمالی عقائد

اُمّتِ مسلمہ پر اصحابِ محمدؐ کے حقوق

تحریر: ڈاکٹر صالح بن عبد العزیز السندی [1]
ترجمہ و توضیح: محمّد حماد امین چاؤلہ [2]

الحمد لله رب العالمين والصلوٰة والسلام علىٰ خاتم الأنبياء وسيد المرسلين وعلىٰ آله وصحبه أجمعين وأزواجه اُمهاتّ المؤمنين ومن تبعهم بإحسان إلىٰ يوم الدّين -

أمّا بعد!

۞ اصحابِ محمدّ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان و مرتبہ کو سمجھنے کے لیے یہ بات کافی ہے کہ یہ وہ عظیم شخصیات ہیں کہ جنہیں اللہ ربّ العالمین نے اپنے سب سے محبوب رسول کی صحبت کے لیے منتخب فرمایا، جن کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے اپنی سب سے عظیم ومبارک کتاب قرآن کریم، اپنے محبوب پیغمبر کے محبوب فرامین، اور اس دین کو محفوظ فرمایا کہ جسے اللہ تعالیٰ نے تمام انسانیت کے بطور رہنمائے زندگی اور بطور نجات اخروی منتخب فرمایا، وہ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کہ جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی زمین پر اللہ کے دین کو نافذ کر کے دکھایا، جنکی عبادات، جنکے معاملات، جنکی قربانیاں، حتی کہ جنکا جینا اور مرنا صرف اور صرف ایک اللہ ربّ العزّت والجلال ہی کے لیے تھا، جن کے ایمان کو اللہ تعالیٰ نے بعد میں آنے والے تمام لوگوں کے ایمان کے لیے بطورِ معیار وضابطہ کے مقرر فرمایا، اور جنکے عمل و منہج کو پوری امت کے لیے باعثِ اقتدا و پیروی کے مقرر فرمایا، جن سے اعلیٰ، اشرف وافضل انسان، انبیاء علیہم السلام کے بعد اس کائینات میں آیا ہے اور نہ ہی آئیگا۔

۞ یہی وجہ ہے شریعتِ مطہّرہ نے جس طرح اللہ ربّ العزت، اسکے عظیم پیغمبر جنابِ محمدؐ کے کچھ حقوق بیان فرمائے ہیں اور انکا خیال رکھنا، انکے تقاضوں کو پورا کرنا، اُمّتِ مسلمہ پر فرض وواجب قرار دیا

---

[1] پروفیسر اسلامک یونیورسٹی مدینہ منورہ
[2] ممبر المدینہ اسلامک ریسرچ سینٹر، ویب سائٹ مینیجر۔

ہے بالکل اسی طرح رسولِ اکرم کے صحابہ کے بھی کچھ حقوق بیان فرمائیں ہیں اور ان حقوق کو پورا کرنا پوری اُمّتِ مسلمہ پر لازم قرار دیا ہے، اور ان حقوق کو اہلِ علم نے کچھ قواعد کی صورت میں اپنی کتبِ عقیدہ میں جمع کیا ہے جن میں سے دس اہم ترین قواعد ہم آپکی خدمت میں پیش کر رہے ہیں ،جنکا شمار شریعتِ مطہّرہ میں عقائد کے باب میں ہوتا ہے۔

- یہ تمام قواعد اہلِ علم نے قرآن و حدیث کی روشنی میں بیان کیے ہیں جنکے دلائل بھی قواعد کے ساتھ ذکر کر دیے گئے ہیں۔
- یہ تحریر میرے استاذِ محترم" فضیلہ الشیخ ڈاکٹر صالح السندی حفظہ اللہ ورعاہ " کی ہے جن کا شمار "مدینہ منورہ کے بڑے علماء" میں ہوتا ہے ،اور یہ تحریر" صحابہ کرام کے بارے میں اہل السنہ والجماعۃ کے اجمالی عقائد " پر مشتمل ہے جسے وہ" اسلامک یونیورسٹی مدینہ منورہ میں عقیدہ کے مضمون " کے تحت پڑھاتے ہیں،اسے استفادہ عام کے لیے " مجلّہ البیان " کے قارئین کی خدمت میں پیش کیا جارہا ہے۔
- یہ ایک طویل تحریر ہے جسکی پہلی قسط اس شمارہ میں دی جارہی ہے،ان شاءاللہ اس ضمن میں مزید اہم امور اگلی قسط میں ذکر کیے جائیں گے۔
- چونکہ یہ تحریر خاص طلباء کے لیے ہے اس لیے اسکے ترجمہ میں کچھ جگہ "ڈبل بریکٹ "کے اندر وضاحت کے طور کچھ اضافہ کیا گیا ہے۔
- قرآن کریم اور احادیث کے ترجمہ کو"سنگل بریکٹ "میں ذکر کیا گیا ہے۔
- محترم شیخ حفظہ اللہ فرماتے ہیں:

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی شخصیات وہ مبارک شخصیات ہیں کہ جن کے ذکر سے دلوں میں سکون وخوشی اور محفلوں میں رونق آجاتی ہے جیسا کہ مؤمنوں کی ماں، رسول اکرم کی محبوب ترین زوجہ ،صدّیق کی بیٹی صدّیقہ، طاہرہ مطہّرہ، سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کا فرمان ہے کہ: اپنی محفلوں کو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے ذکر سے

مزیّن کیا کرو[1]۔

ہم یہاں بطورِ خلاصہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے بارے میں اہل السنۃ والجماعۃ "سلف صالحین رحمہم اللہ" رحمہم اللہ کے عقائد کا ذکر کرتے ہیں جو کہ دس انتہائی اہم قواعد پر مشتمل ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں:

﴿پہلا قاعدہ﴾

اپنے دلوں کو صحابہ کرام کی محبت سے منوّر رکھنا اور عمل سے اسکا اظہار کرنا:

قرآن مجید میں فرمانِ باری تعالی ہے:

﴿ وَٱلَّذِينَ جَآءُو مِنۢ بَعۡدِهِمۡ يَقُولُونَ رَبَّنَا ٱغۡفِرۡ لَنَا وَلِإِخۡوَٰنِنَا ٱلَّذِينَ سَبَقُونَا بِٱلۡإِيمَٰنِ وَلَا تَجۡعَلۡ فِي قُلُوبِنَا غِلّٗا لِّلَّذِينَ ءَامَنُواْ رَبَّنَآ إِنَّكَ رَءُوفٞ رَّحِيمٌ ﴿١٠﴾ ﴾ الحشر: ١٠

ترجمہ:" اور (ان کے لئے) جو ان کے بعد آئیں اور کہیں گے کہ اے ہمارے پروردگار ہمیں بخش دے اور ہمارے ان بھائیوں کو بھی جو ہم سے پہلے ایمان لا چکے اور ایمانداروں کی طرف ہمارے دل میں کہیں (اور دشمنی) نہ ڈال اے ہمارے رب بیشک تو شفقت ومہربانی کرنے والا ہے"۔

اسی طرح رسولِ اکرم ﷺ کا فرمانِ مبارک ہے:

انصار صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے محبت کرنا ایمان کی علامت ہے اور ان سے بغض رکھنا نفاق کی علامت ہے۔[2] جب انصار صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین سے بغض نفاق کی علامت ہے تو مہاجرین صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین سے بغض تو لازمی نفاق شمار ہوگا کیونکہ مہاجرین صحابہ، انصار صحابہ سے من جملہ افضل ہیں۔

اسی طرح اصحابِ رسول ﷺ کی محبت کے دلائل، عقیدہ کے اہم ترین جزء "اللہ تعالی ہی کے لیے محبت کرنے" کے عمومی دلائل میں داخل ہیں کیونکہ جن عظیم شخصیات سے انسان اللہ تعالی کی خاطر محبت کرتا ہے ان میں انبیاء علیہم السلام کے بعد سرِ فہرست محمد رسول اللہ ﷺ کے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین ہیں۔

یہ اہم قاعدہ امام طحاوی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب عقیدہ طحاویہ میں ذکر فرمایا ہے:

" آپ (اہل السنہ سلف کا عقیدہ ذکر کرتے ہوئے) فرماتے ہیں: ہم رسول اللہ ﷺ کے صحابہ سے محبت

---

[1] منهاج السنة (566)

[2] صحیح بخاری 1/14، ح:17 صحیح مسلم 1/85، ح:74

کرتے ہیں اور ان میں سے سے کسی کی محبت میں غلو نہیں کرتے اور نہ ہی کسی پر تبرّاء کرتے ہیں۔اور ہم ہر اس شخص سے بغض و نفرت کرتے ہیں جو صحابہ سے بغض رکھتا ہے، اور ہم ہمیشہ خیر و بھلائی کے ساتھ ہی انکا ذکر کرتے ہیں، ان سے محبت کرنا دین ہے، ایمان ہے، احسان ہے، جبکہ ان سے بغض رکھنا کفر ہے ،نفاق ہے اور سرکشی و فساد کا سبب ہے"۔ [1]

اسی طرح امام لالکائی امام مالک رحمہا اللہ کا فرمان روایت کرتے ہیں کہ امام مالک رحمہ اللہ نے فرمایا:" سلف صالحین رحمہم اللہ اپنی اولادوں کو جناب ابو بکر رضی اللہ عنہ اور جناب عمر رضی اللہ عنہ کی محبت اسطرح سکھایا کرتے جس طرح انہیں قرآن کریم کی کوئی سورت سکھاتے"۔ [2]

مذکورہ قرآن کریم کی آیت، رسول اکرم ﷺ کا فرمان اور اقوال سلف، اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی محبت ایمان کا حصہ بلکہ ایمان کی علامت ہے اور اسکے مقابلہ میں جس کے دل میں صحابہ کرام کی رضوان اللہ علیہم اجمعین محبت نہیں یا وہ صحابہ سے کسی بھی وجہ سے کسی بھی قسم کا کوئی بغض یا عناد رکھے وہ منافق ہے اور اسکا ایمان خطرہ میں ہے، اسی لیے ہر مسلمان کو سلف صالحین کی طرح صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے محبت کی تعلیم اپنی اولاد کو دینی چاہیے اور ہر اس شخص سے بغض و عناد رکھنا چاہیے جو محمّد الرسول اللہ ﷺ کے صحابہ سے بغض رکھے اور اس سے براءت کرنی چاہیے جو صحابہ پر تبرّاء کرے۔

﴿دوسرا قاعدہ﴾

صحابہ کرام کے بارے میں یہ عقیدہ رکھنا کہ وہ انبیاء ورسل علیہم السلام کے بعد سب سے افضل ہیں اور اس امت میں ان سے بڑھکر اہلِ حق کوئی نہیں اور شرف و منزلت میں ان سے باکمال اوران کا ثانی کوئی نہیں:

قرآن کریم، احادیثِ مبارکہ، آثارِ صحابہ اور اقوالِ سلف صالحین میں صحابہ کرام کی فضیلت پر مشتمل بے شمار دلائل موجود ہیں جن کا ذکر اس مختصر سے مضمون میں ممکن نہیں ہے لیکن یہاں ہم چند اہم دلائل کا ذکر کرتے ہیں جو صحابہ کرام کی فضیلت کو سمجھنے کے لیے کافی وشافی ہیں۔

[1] شرح العقیدہ الطحاویة:2/704

[2] شرح أصول الاعتقاد: 7/1240

صحابہ کرام کی فضیلت "قرآن مجید" کی روشنی میں!

1 فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَٱلسَّٰبِقُونَ ٱلْأَوَّلُونَ مِنَ ٱلْمُهَٰجِرِينَ وَٱلْأَنصَارِ وَٱلَّذِينَ ٱتَّبَعُوهُم بِإِحْسَٰنٍ رَّضِىَ ٱللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا۟ عَنْهُ وَأَعَدَّ لَهُمْ جَنَّٰتٍ تَجْرِى تَحْتَهَا ٱلْأَنْهَٰرُ خَٰلِدِينَ فِيهَآ أَبَدًا ۚ ذَٰلِكَ ٱلْفَوْزُ ٱلْعَظِيمُ ﴾ التوبة: ۱۰۰

ترجمہ: "وہ مہاجر اور انصار (صحابہ) جنہوں نے سب سے پہلے ایمان لانے میں سبقت کی اور وہ لوگ جنہوں نے احسن طریق پر ان کی اتباع کی، **اللہ ان سب سے راضی ہوا** اور وہ اللہ سے راضی ہوئے۔ اللہ نے ان کے لئے ایسے باغ تیار کر رکھے ہیں جن میں نہریں جاری ہیں۔ وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے یہی بہت بڑی کامیابی ہے "۔

اس آیت میں اللہ تعالی نے تمام انصار و مہاجرین صحابہ اور انکے پیروکاروں سے راضی ہونے کا اعلان کیا اور ان سب کو اہلِ جنت قرار دیا ہے۔

2 ایک اور مقام پر فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ وَهَاجَرُوا۟ وَجَٰهَدُوا۟ فِى سَبِيلِ ٱللَّهِ وَٱلَّذِينَ ءَاوَوا۟ وَّنَصَرُوٓا۟ أُو۟لَٰٓئِكَ هُمُ ٱلْمُؤْمِنُونَ حَقًّا ۚ لَّهُم مَّغْفِرَةٌ وَرِزْقٌ كَرِيمٌ ﴿٧٤﴾ ﴾ **الأنفال: ۷٤**

ترجمہ: "اور جو لوگ ایمان لائے اور ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا، اور جن لوگوں نے انہیں پناہ دی اور ان کی مدد (ونصرت) کی، یہی لوگ حقیقی مومن ہیں۔ ان کے لئے بخشش اور عزت کا رزق ہے۔)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مہاجرین اور انصار صحابہ دونوں کا تذکرہ فرماکر انہیں "حقیقی مؤمن" کا خطاب عطا فرمایا ہے اور اپنی مغفرت و عزت کا وعدہ کیا ہے۔

3 ایک اور مقام پر فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ مُّحَمَّدٌ رَّسُولُ ٱللَّهِ ۚ وَٱلَّذِينَ مَعَهُۥٓ أَشِدَّآءُ عَلَى ٱلْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ ۖ تَرَىٰهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَبْتَغُونَ فَضْلًا مِّنَ ٱللَّهِ وَرِضْوَٰنًا ۖ سِيمَاهُمْ فِى وُجُوهِهِم مِّنْ أَثَرِ ٱلسُّجُودِ ۚ ذَٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِى ٱلتَّوْرَىٰةِ ۚ وَمَثَلُهُمْ فِى ٱلْإِنجِيلِ كَزَرْعٍ أَخْرَجَ شَطْـَٔهُۥ فَـَٔازَرَهُۥ فَٱسْتَغْلَظَ فَٱسْتَوَىٰ عَلَىٰ سُوقِهِۦ يُعْجِبُ ٱلزُّرَّاعَ لِيَغِيظَ بِهِمُ ٱلْكُفَّارَ ۗ وَعَدَ ٱللَّهُ ٱلَّذِينَ

ءَامَنُواْ وَعَمِلُواْ ٱلصَّٰلِحَٰتِ مِنۡهُم مَّغۡفِرَةٗ وَأَجۡرًا عَظِيمَۢا ﴿٢٩﴾ ﴾ الفتح: ۲۹

ترجمہ: "محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ آپ کے ساتھ ہیں وہ کافروں پر تو سخت (مگر) آپس میں رحم دل ہیں۔ تم جب دیکھو گے انہیں رکوع و سجود کرتے ہوئے اور اللہ کے فضل اور اس کی رضا مندی کی تلاش کرتے ہوئے دیکھو گے (کثرت) سجدہ کی وجہ سے ان کی پیشانیوں پر امتیازی نشان موجود ہیں۔ ان کی یہی صفت تورات میں بیان ہوئی ہے اور یہی انجیل میں ہے جیسے ایک کھیتی ہو جس نے اپنی کونپل نکالی پھر اسے مضبوط کیا، پھر وہ موٹی ہوئی اور اپنے تنے پر کھڑی ہوگئی (اُس وقت وہ) کسانوں کو خوش کرتی ہے۔ تاکہ کافروں کو ان کی وجہ سے غصہ دلائے۔ اس گروہ کے لوگ جو ایمان لائے اور نیک عمل کئے اللہ نے ان سے مغفرت اور بڑے اجر کا وعدہ فرمایا ہے۔

اس آیت میں بھی صحابہ کی فضیلت، اہمیت اور انکی صفاتِ حمیدہ کا بیان ہے، یہی نہیں بلکہ اصحابِ محمد کی یہ صفات اللہ تعالیٰ نے توراۃ وانجیل میں بھی بیان فرمائی ہیں اور یہ بات انکی امتیازیت اورامت میں سب سے منفرد مقام پر دلالت کرتی ہے اور اس آیت کے آخر میں موجود الفاظ " لِيَغِيظَ بِهِمُ ٱلۡكُفَّارَ" (کہ اللہ تعالیٰ کی صحابہ کی فضیلت میں یہ باتیں کافروں کو غیظ وغضب میں مبتلا کر دیتی ہیں) کے ذریعہ امام مالک و دیگر اہل علم نے یہ استدلال کیا ہے کہ جو صحابہ سے بغض وعناد رکھے گا وہ کافر ہے۔

4 اسی طرح ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿ لَا يَسۡتَوِي مِنكُم مَّنۡ أَنفَقَ مِن قَبۡلِ ٱلۡفَتۡحِ وَقَٰتَلَۚ أُوْلَٰٓئِكَ أَعۡظَمُ دَرَجَةٗ مِّنَ ٱلَّذِينَ أَنفَقُواْ مِنۢ بَعۡدُ وَقَٰتَلُواْۚ وَكُلّٗا وَعَدَ ٱللَّهُ ٱلۡحُسۡنَىٰۚ وَٱللَّهُ بِمَا تَعۡمَلُونَ خَبِيرٞ ﴿١٠﴾ ﴾ الحدید: ۱۰

ترجمہ: "جن لوگوں نے فتح (مکہ) کے بعد خرچ اور جہاد کیا وہ ان لوگوں کے برابر نہیں ہوسکتے جنہوں نے فتح سے پہلے خرچ اور جہاد کیا۔ یہی لوگ درجہ میں زیادہ ہیں۔ تاہم اللہ نے ہر ایک سے اچھا وعدہ کیا ہے۔ اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے پوری طرح باخبر ہے"۔

اس آیت میں انصار صحابہ کے مقابلہ میں مہاجرین صحابہ کی فضیلت بیان کی گئی لیکن آیت کے آخر میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا " وَكُلّٗا وَعَدَ ٱللَّهُ ٱلۡحُسۡنَىٰ " کہ (اگرچہ فضیلت میں مہاجرین انصار سے بڑھکر ہیں لیکن) اللہ تعالیٰ نے ان سب سے جنت کا وعدہ فرمایا ہے۔ اسی آیت سے اہلِ علم نے تمام صحابہ کے جنتی

ہونے پر استدلال کیا ہے۔

اس کے علاوہ یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ مکمل قرآن مجید میں جہاں کہیں اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان کی تعریف وفضیلت میں جو کچھ بھی ارشاد فرمایا ہے اس فضیلت کے اوّلین مصداق اصحابِ محمدّ ﷺ ہی ہیں ؛ کیونکہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کے سب سے پہلے مخاطبین ، اللہ اور اسکے رسول ﷺ پر سب سے پہلے ایمان لانے والے ، اللہ اور اسکے رسول ﷺ کی بات کو سب سے پہلے سننے ، سمجھنے ،اس پر عمل کرنے ، اُسے آگے پھیلانے والے ، محمد عربی ﷺ کی صحبت میں زندگیاں گزارنے والے ، یہی اصحابِ محمدّ ﷺ ہیں رضی اللہ عنہم اجمعین۔

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی فضیلت "احادیث مبارکہ" کی روشنی میں!

1. رسولِ اکرم ﷺ کا فرمانِ مبارک ہے: "ستارے آسمان کے لئے امان ہیں جب ستاروں کا نکلنا بند ہو جائے گا تو پھر آسمان پر وہی آجائے گا جس کا وعدہ کیا گیا،(یعنی قیامت قائم ہو جائیگی) ۔اور میں اپنے صحابہ کے لئے امان ہوں، جب میں چلا جاؤں گا تو میرے صحابہ پر وہ آزمائیشیں آجائیں گی جن کی انہیں خبر دی گئی۔اور میرے صحابہ میری امت کے لئے امان ہیں، تو جب صحابہ کرام چلے جائیں گے تو میری امت پر وہ سب فتنے ٹوٹ پڑیں گے کہ جن کی انہیں پختہ خبر دی گئی ہے"۔ [1]

رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان اس بات کی دلیل ہے کہ آپ ﷺ کا وجودِ مبارک صحابہ کرام کے لیے اور صحابہ کرام کا وجودِ مبارک بقیہ امت کے لیے فتنوں سے بچاؤ کا ذریعہ تھا کیونکہ رسولِ اکرم ﷺ کے بعد صحابہ کرام آزمائیشوں کا شکار ہوئے، صحابہ کرام کی شہادتیں ہوئیں، منافقین، روافض وخوارج اور دیگر گمراہ فرقوں نے سر اٹھانا شروع کردیا۔اور صحابہ کی موجودگی میں جو خیر امت میں موجود تھی،عقیدہ توحید کا غلبہ ، کفار پر برتری، اسلام ومسلمانوں کا عروج و وقار ودیگر اچھائیاں وہ صحابہ کرام کے دنیا سے چلے جانے کے بعد آہستہ آہستہ ختم ہوتی گئیں اور امت میں فتنہ ،انتشار، گمراہیت ،باطل افکار و نظریات، کفار کا غلبہ ،اغیار کی تہذیب وثقافت،یہود ونصاریٰ کی مشابہت ودیگر برائیاں تیزی سے پھیلتی وبڑھتی ہی چلے گئیں۔

---

[1] صحيح مسلم 1961/ 4 ح:2531

2. اسی طرح رسولِ اکرم ﷺ کا ایک اور فرمانِ مبارک ہے کہ: "میرے صحابہ پر سبّ وشتم مت کرو، انہیں برا مت کہو، (اور جان لو کہ) اگر تم میں سے کوئی بھی (اللہ تعالیٰ کے راستے میں) اُحد (جیسے بڑے پہاڑ) کے برابر سونا خرچ کرے تو (اسکے مقابلہ میں) میرے ادنیٰ سے صحابہ کے خرچ کیے ہوئے آدھا کلو بلکہ ایک پاؤ (گندم) کے برابر بھی نہیں پہنچ سکتا"۔ [1]

یہ روایت اصحابِ محمدّ ﷺ میں ادنیٰ سے صحابی کی امت کے بڑے سے بڑے بزرگ پر برتری وفضیلت پر دلالت کرتی ہے۔

3. اسی طرح رسولِ اکرم ﷺ نے ایک اور مقام پر فرمایا کہ: "تمام لوگوں میں سب سے بہترین لوگ میرے زمانے کے ہیں (یعنی صحابہ کرام ہیں) پھر انکے بعد والے (یعنی تابعین رحمہم اللہ) پھر انکے بعد والے (یعنی تبع تابعین)"۔ [2]

اس روایت میں امت مسلمہ کی تاریخ کے سب سے بہترین زمانے کی خبر دی گئی ہے کہ زمانوں میں بہترین زمانہ صحابہ کرام کا ہے، پھر انکے بعد والے تابعین کا، پھر انکے بعد والے تبع تابعین کا۔

صحابہ کرام کی فضیلت "اقوال صحابہ" کی روشنی میں !

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی فضیلت میں وارد اقوالِ صحابہ میں جناب سیدنا عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا فرمان کافی وشافی ہے۔ سیدنا عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

"جو بھی یہ چاہتاہے کہ کسی کی اقتداء وپیروی کرے وہ فوت شدہ کی پیروی کرے (یعنی اسے چاہیے کہ وہ صحابہ کرام کی پیروی کرے جو فتنوں کے نزول سے پہلے فوت ہو چکے ہیں) کیونکہ اب جو زندہ ہیں وہ فتنوں سے محفوظ نہیں، اور وہ محمدّ ﷺ کے صحابہ تھے جو اللہ کی قسم ! اس امت میں سب سے افضل تھے، جن کے دل سب سے نیک، علم میں سب سے زیادہ اور تکلفات میں سب سے کم تھے۔ وہ عظیم جماعت کہ جنہیں اللہ تعالی نے اپنے پیغمبر ﷺ کی صحبت وساتھ کے لیے اور اپنے دین کی سربلندی وقیام کے لیے منتخب فرمایا، تو (اللہ کے بندوں !) ان (صحابہ) کی فضیلت کو پہچانو، اور ان کے نقشِ قدم

---

[1] صحيح بخاري 3/1343 ح: 3470 و صحيح مسلم 4/1967 ح: 2540

[2] صحيح بخاری 2/938 ح: 2509 و صحيح مسلم 4/1963 ح: 2533

کی پیروی کرو، اور اپنی استطاعت کے مطابق انکے اخلاق و کردار اور دین و منہج کو عملاً تھام لو، کیونکہ وہ سب ہدایت وسیدھے راستے پر تھے۔[1]

یہی بات مختلف الفاظ سے سیدنا ابنِ عمر رضی اللہ عنہ، قتادہ اور حسن بصری رحمہا اللہ سے بھی منقول ہے۔

امام ابنِ قیم رحمہ اللہ سیدنا ابنِ مسعود رضی اللہ عنہ کے مذکورہ فرمان کی شرح میں فرماتے ہیں: "یہ تینوں درجات یعنی" علم، عدل[2] اور جہاد " یہی وہ درجات ہیں جن کی بدولت انسان ایک دوسرے پر سبقت اور شرف و منزلت حاصل کرتا ہے۔ اور صحابہ کرام میں یہ سب بدرجہ اتم موجود تھے جنکی بدولت وہ شرف ومنزلت میں سب سے سبقت لے گئے، اوراپنے سے پہلے والوں کی فضیلت ورتبہ کو پہنچے اور اپنے بعد آنے والوں پر فوقیت لے گئے، اور انہی صفات کے ذریعہ وہ طویل مدّت تک لوگوں پر حکمران رہے اورعزت و سعادت کی حدوں کو پار کرگئے، یہی صحابہ کرام ہیں جو دینِ اسلام کے ہم تک پہنچنے کا ذریعہ بنے، جن کے سبب ہر قسم کی خیر وبھلائی اور ہدایت پوری اُمّت کو حاصل ہوئی، انہی کی (اتباع وپیروی کے) ذریعہ دنیاوی سعادت اور اخروی نجات ممکن ہے، صحابہ کرام اس امت میں سب سے بڑھ کر عدل وانصاف کے ساتھ حکومت کرنے والے، اور سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ کے راستے میں جہاد کرنے والے تھے، پس (اس بات کو سمجھ لو کہ) پوری اُمت قیامت تک کے لیے انہی کے علم، عدل اور جہاد کی پیروی کرے گی، اورامت کے کسی بھی فرد کو (اگر) علمِ نافع حاصل ہو گا تو انہی کے ذریعہ اور انہی کے طریقہ و منہج پر حاصل ہو گا، اوراس پورے خطہ ارضی پر جہاں کہیں بھی امن وامان قائم ہو گا وہ انہی کے جہاداور فتوحات کی بدولت ہو گا، (کیونکہ صحابہ جہاد کے ذریعہ جہاں اور جس علاقہ کو فتح کرتے وہاں پر عدل وانصاف اور امن وامان قائم کرتے، انکے بعد اس اُمت کا کوئی بھی فرد یہ کام کرے گا تو وہ صحابہ ہی کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے کرے گا) اور جو کوئی امام و حاکم عدل وہدایت کے ذریعہ فیصلہ وحکومت کرتا ہے تو اسکا بنیادی سبب بھی صحابہ ہی ہیں۔ اصحابِ محمّد نے تلوار کے ذریعہ شہروں کو فتح کیا اور ایمان کے ذریعہ دلوں کو فتح کیا، عدل و انصاف کے ذریعہ شہروں کو آباد کیا اور علم وہدایت کے ذریعہ دلوں کو

---

[1] جامع بیان العلم وفضله 2/947 ذم الکلام للهروي 288 /4 اور دیکھیے منهاج السنة لابنِ تیمیة 77,76/ 2 و مجموع الفتاویٰ لابن تیمیة 3/126

[2] یہ وہ صفت ہے جو انسان کو دینی و دنیاوی ہر لحاظ سے قابلِ اعتماد بنائے

آباد کیا۔ قیامت تک اُمت کے ہر فرد کے ہر نیک عمل کے اجر میں صحابہ کرام برابر کے شریک ہوں گے ، جبکہ اسکے علاوہ جو اعمالِ صالحہ انہوں نے خود انجام دیے انکا اضافی اجر بھی انکے ساتھ خاص ہے۔ پس ہر قسم کے عیوب سے پاک ہے اللہ تعالیٰ کی وہ مبارک ذات کہ جو جسے چاہتا ہے اپنے فضل و رحمت کے ساتھ (شرف و منزلت کے لیے)منتخب فرماتا ہے۔ [1]

شیخ الاسلام امام ابنِ تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''جو شخص بھی علم و بصیرت کے ساتھ صحابہ کرام کی سیرت اور فضائل و مناقب کی صورت میں جو اُن پر اللہ تعالیٰ نے احسانات فرمائے ہیں انکا بغور مطالعہ کریگا تو یقینی طور پر یہ بات جان لے گا کہ محمد الرسول اللہ کے صحابہ ،انبیاء علیہم السلام کے بعد اس دنیا میں سب سے بہتر و افضل ہیں ،نہ ہی اُن سے پہلے کوئی اُن جیسا عظیم تھا اور نہ ہی اُنکے بعد کوئی اُن جیسا عظیم ہو گا،اور اس اُمت کی صدیوں میں سب سے بہترین صدی انکی اوراس پوری اُمت میں جو کہ تمام اُمتوں میں سب سے بہترین اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے معزز اُمت ہے،اُن میں سب سے بہترین و منتخب لوگ صحابہ کرام ہیں''۔ [2]

﴿تیسرا قاعدہ﴾

صحابہ کرام کے بارے میں یہ عقیدہ رکھنا کہ شریعت میں وارد نصوص کی روشنی میں اُن میں سے بعض کا مرتبہ، بعض پر زیادہ ہے۔

اہل السنہ والجماعۃ سلف صالحین کا یہ عقیدہ ہے، انبیاء علیہم السلام کے بعد افضل ترین لوگ صحابہ کرام ہیں. اور پھر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میں سب سے افضل عشرہ مبشرون بالجنہ ہیں ،یعنی وہ دس صحابہ جنہیں رسولِ اکرم ﷺ نے دنیا میں ہی جنّت کی خوشخبری دی،اور ان دس صحابہ میں سرِ فہرست چاروں خلفاءِراشدین یعنی سیدنا ابو بکر ،سیدنا عمر ،سیدنا عثمان اور سیدنا علی رضوان اللہ علیہم اجمعین ہیں اور بقیہ چھ کے نام یہ ہیں سعید ، سعد، عبد الرحمٰن بن عوف، طلحہ بن زبیر ،عامر اور زبیر بن عوام رضوان اللہ علیہم اجمعین۔

اور ان دس صحابہ کرام میں سب سے افضل صحابہ چاروں خلفاء یعنی سیدنا ابو بکر ،سیدنا عمر،سیدنا عثمان اور

---

[1] طریق الھجرتین :537

[2] العقیدۃ الواسطیۃ 45 مجموع الفتاویٰ :156/ 3

سیدنا علی رضی اللہ عنہم اجمعین ہیں.

اور پھر ان چاروں میں سب سے افضل شیخین کریمین یعنی خلیفہ اوّل سیدنا ابو بکر اور خلیفہ ثانی سیدنا عمر ہیں رضی اللہ عنہما.

اور پھر ان دونوں یعنی شیخین میں افضل خلیفہ اوّل، سسرِ رسول، سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ ہیں.

سیدنا عثمان اور سیدنا علی رضی اللہ عنہما کے درمیان مفاضلت!

سیدنا عثمان اور سیدنا علی رضی اللہ عنہما میں کون افضل ہے اس مسئلہ میں قدیم زمانہ سے اختلاف موجود ہے جو کہ تین آراء پر مشتمل ہے:

1. سیدنا عثمان، سیدنا علی سے افضل ہیں رضی اللہ عنہما، یہی رائے جمہور اکثر اہلِ علم کی ہے۔
2. سیدنا علی، سیدنا عثمان سے افضل ہیں رضی اللہ عنہما۔ یہ رائے بعض اہلِ کوفہ اور خاص طور پر امام سفیان ثوری رحمہ اللہ کی تھی اور بعد میں انہوں نے اپنی رائے سے رجوع کر لیا تھا جیسا کہ حافظ ابنِ حجر اور شیخ الاسلام ابنِ تیمیہ رحمہما اللہ نے ذکر کیا ہے۔[1]
3. اس مسئلہ میں تیسرے رائے توقّف کی ہے، یعنی دونوں میں سے کسی ایک کو دوسرے پر فضیلت دینے کے بجائے خاموشی اختیار کی جائے۔ یہ رائے اس مسئلہ میں امام مالک سے مروی دو قول میں سے ایک کی ہے[2]، لیکن بعد میں امام مالک سے یہ مروی ہے کہ انہوں نے اپنی اس رائے سے رجوع کر کے جمہور اہلِ علم کی رائے کو اختیار کر لیا تھا جو کہ سیدنا عثمان کی سیدنا علی رضی اللہ عنہما پر فضیلت کی ہے۔

اب اگرچہ اس مسئلہ میں اہلِ علم کے مابین قدیم اختلاف موجود ہے لیکن ایک تو اہلِ علم کی اکثریت کی رائے میں سیدنا عثمان، سیدنا علی رضی اللہ عنہما پر فضیلت رکھتے ہیں اور پھر دوسری بات یہ کہ بعد کے ادوار سے اہل السنہ کا عملاً اس بات پر اتفاق چلا آرہا ہے کہ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ، سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے افضل ہیں، اسی لیے آج بھی جب خلفاء راشدین کا ذکر کیا جاتا ہے تو سیدنا ابو بکر و عمر کے بعد سیدنا عثمان کا پھر سیدنا علی کا نام

---

[1] منهاج السنة 2/74,73 و فتح الباری 7/21
[2] منهاج السنة 2/74,73 و فتح الباری 7/21

لیا جاتا ہے رضوان اللہ علیہم اجمعین۔

یہی بات شیخ الاسلام امام ابنِ تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ ،[1] حافظ ابنِ حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ،[2] امام ابو عمر ابنِ عبد البر رحمۃ اللہ علیہ[3] اور حافظ خطابی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کی ہے۔

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میں عشرہ مبشرہ یعنی مذکورہ دس صحابہ کے بعد، افضل ترین صحابہ، اہلِ بدر ہیں یعنی وہ جو جنگِ بدر میں شریک تھے، پھر اہلِ اُحد ہیں یعنی وہ جو جنگِ اُحد میں شریک تھے، پھر اہلِ بیعتِ رضوان ہیں یعنی وہ جو بیعتِ رضوان میں موجود تھے رضوان اللہ علیہم اجمعین۔

صحابہ کرام میں آپس میں مفاضلت کے اس سلسلہ کی وضاحت اہلِ علم کی ایک بڑی جماعت نے بیان کی ہے جن میں سرِ فہرست حافظ ابن الصلاح، امام نووی، حافظ ابنِ کثیر وغیرہم شامل ہیں، جبکہ امام سفارینی نے اہلِ بیعتِ رَضوان کو اہلِ اُحد پر مقدم رکھا ہے۔

اسی طرح یہ بات بھی ذہن نشین رہے کہ تمام صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میں عموماً مہاجرین صحابہ[4]، انصار صحابہ[5] سے افضل ہیں، اسی طرح وہ صحابہ جو ابتداء اسلام میں ایمان لائے وہ بعد میں ایمان لانے والوں سے افضل ہیں۔

صحابیات میں افضل ترین!

جہاں تک خواتین صحابیات رضی اللہ عنھن کا تعلق ہے تو اہل السنہ سلف صالحین رحمهم الله تعالیٰ اس بات پر متفق ہیں کہ اس اُمت میں سب سے افضل خواتین سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا، سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا اور سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا ہیں، جیسا کہ شیخ الاسلام ابنِ تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" اس امت میں جو سب سے افضل ترین خواتین ہیں وہ سیدہ خدیجہ ، سیدہ عائشہ ، سیدہ فاطمہ ہیں رضی اللہ عنھن، لیکن ان تینوں میں سب سے افضل کون ہیں ، یہ مسئلہ شدید اختلافی اور انتہائی وضاحت طلب

---

[1] منهاج السنة 2/74

[2] فتح الباری 2/21

[3] الإستذكار لابنِ عبدالبر : 5/109

[4] وہ اہلِ مکہ جنھوں نے رسول اکرم کی اقتداء میں مکہ المکرمہ سے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت فرمائی تھی

[5] جو اہلِ مدینہ ، جنھوں نے زمانہ ہجرت کے بعد اسلام و مسلمانوں کی مدد کی تھی

مسئلہ ہے"[1]۔

بعض اہلِ علم سیدہ خدیجہ کو افضل ترین قرار دیتے ہیں، بعض سیدہ عائشہ کو اور بعض سیدہ فاطمہ کو رضی اللہ عنہن۔

﴿چوتھا قاعدہ﴾

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی تعریف بیان کرنا، انکی اچھائیوں کو نشر کرنا اور ہمیشہ خیر و بھلائی کے ساتھ انکا تذکرہ کرنا۔

یہ قاعدہ اس باب میں بیان کے گئے پہلے اور چوتھے قاعدہ کا ذیلی حصہ ہے یعنی صحابہ کرام کی محبت سے اپنے دلوں کو منور کرنا اور اس بات کا عقیدہ رکھنا کہ وہ انبیا علیہم السلام کے بعد سب سے افضل ترین لوگ ہیں، کیونکہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی محبت اور انکی افضلیت کا عقیدہ اس بات کا متقاضی ہے کہ انکی تعریف کی جائے اور انکی اچھائیوں اور محاسن کو بھرپور انداز سے بیان کیا جائے اور جب بھی انکا ذکر کیا جائے ہمیشہ خیر کے ساتھ کیا جائے۔ اور قرآن وحدیث میں موجود جتنے بھی دلائل صحابہ کی محبت اور انکی فضیلت میں مذکور ہیں وہ سب اس قاعدہ کے دلائل کے زمرہ میں آتے ہیں۔

﴿پانچواں قاعدہ﴾

اس بات کی گواہی دینا کہ اللہ تعالیٰ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے راضی ہو گیا اور ان پر اپنی رحمت نازل فرماتا ہے، اور تمام صحابہ جنتی ہیں بالخصوص وہ جن کا نام لیکر رسول اکرم ﷺ نے انہیں جنت کی بشارت دی۔

اہل السنہ والجماعہ عموماً تمام صحابہ کرام کے جنتی ہونے کا عقیدہ رکھتے ہیں کیونکہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے انصار و مہاجرین کا تزکرہ فرما کر ان سب سے راضی ہونے اور انکے جنتی ہونے کی خبر دی ہے:

﴿ وَٱلسَّٰبِقُونَ ٱلۡأَوَّلُونَ مِنَ ٱلۡمُهَٰجِرِينَ وَٱلۡأَنصَارِ وَٱلَّذِينَ ٱتَّبَعُوهُم بِإِحۡسَٰنٖ رَّضِيَ ٱللَّهُ عَنۡهُمۡ وَرَضُواْ عَنۡهُ وَأَعَدَّ لَهُمۡ جَنَّٰتٖ تَجۡرِي تَحۡتَهَا ٱلۡأَنۡهَٰرُ خَٰلِدِينَ فِيهَآ أَبَدٗاۚ ذَٰلِكَ ٱلۡفَوۡزُ ٱلۡعَظِيمُ ﴾

ترجمہ: "وہ مہاجر اور انصار (صحابہ) جنہوں نے سب سے پہلے ایمان لانے میں سبقت کی اور وہ لوگ جنہوں نے احسن طریق پر ان کی اتباع کی، اللہ ان سب سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے۔ اللہ نے ان کے لئے ایسے باغ تیار کر رکھے ہیں جن میں نہریں جاری ہیں۔ وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے یہی بہت

[1] مجموع الفتاویٰ : 4/394

بڑی کامیابی ہے"۔

اسی طرح ایک اور مقام پر فرمایا: " وَكُلًّا وَعَدَ اللَّهُ الْحُسْنَىٰ " اللہ نے (اُن میں سے) ہر ایک سے اچھا (یعنی جنت کا) وعدہ کیاہے۔

ہاں صحابہ کرام میں نام لیکر تعیین کے ساتھ جنتی ہونے کا ذکر ہم ان کا کرتے ہیں جنکی تعیین کتاب و سنت میں کی گئی ہے جن میں سرِ فہرست عشرہ مبشرہّ وہ دس صحابہ ہیں جن کا ذکر پیچھے گذر چکا ہے، اورانکے علاوہ سیدنا عبداللہ بن سلام، سیدنا حمزہ بن عبد المطلب، سیدنا عکاشہ بن محصن اور وہ عورت کہ جو دودھ دھویا کرتی تھی شامل ہیں [1]۔

﴿چھٹا قاعدہ﴾

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے لیے دعاءِ خیر کرنا اور استغفار کرنا اور ان سے راضی وخوش رہنا۔

اس قاعدہ کی دلیل قرآن کریم کہ وہ آیت ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان کی ایک اہم صفت کا تذکرہ فرمایاہے کہ وہ اپنے سے پہلے والے اہلِ ایمان کے لیے دعاء کرتے ہیں اور یقیناً اس اُمت میں جو سب سے پہلے ایمان لانے ہیں وہ اصحابِ محمد ہی ہیں، فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَالَّذِينَ جَاءُو مِنْ بَعْدِهِمْ يَقُولُونَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِإِخْوَانِنَا الَّذِينَ سَبَقُونَا بِالْإِيمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِي قُلُوبِنَا غِلًّا لِلَّذِينَ آمَنُوا رَبَّنَا إِنَّكَ رَءُوفٌ رَحِيمٌ ﴿١٠﴾ ﴾ الحشر: ١٠

ترجمہ:"اور (ان کے لئے) جو ان کے بعد آئیں اور کہیں گے کہ اے ہمارے پروردگار ہمیں بخش دے اور ہمارے ان بھائیوں کو بھی جو ہم سے پہلے ایمان لاچکے اور ایمانداروں کی طرف ہمارے دل میں کہیں (اور دشمنی) نہ ڈال اے ہمارے رب بیشک تو شفقت ومہربانی کرنے والا ہے"۔

﴿ساتواں قاعدہ﴾

انکی خطاؤں پر خاموش رہنا اور اُن کے عیوب سے صرفِ نظر کرنا!

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا عالی مرتبت اور انبیاء علیہم السلام کے بعد سب سے افضل ہونا یہ معنی نہیں رکھتا کہ وہ

[1] شیخ سلمان حفظہ اللہ نے عقیدۃ الواسطیۃ کی شرح "الکواشف الجلیّۃ"صفحہ :(689-696)میں (41) صحابہ کا ذکر کیاہے جنہیں جنّت کی بشارت دی گئی ہے۔

گناہوں سے معصوم ہوں[1]، بلکہ وہ بھی انسان تھے اور انسان سے غلطی ہوتی ہے، اُن سے بھی ہوئی، لیکن یقیناً یہ بات ضرور ہے کہ اُن سے جو معمولی غلطیاں ہوئیں وہ ہرگز اُن غلطیوں جیسی نہیں ہوسکتیں جو انکے علاوہ کسی اور سے سرزد ہوں۔

اس لیے یہ جاننا بہت ضروری ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے بارے میں جو کچھ بھی ایسا مروی ہے جو انکی شان و مرتبہ میں نقص پیدا کرتا ہے وہ تین باتوں سے خالی نہیں:

1. وہ سند کے اعتبار سے درست نہ ہو یعنی جس ذریعہ سے صحابہ کے بارے میں ہم تک وہ خبر پہنچی ہے وہ محدّثین کے متفقہ قواعد کے مطابق ناقابلِ اعتبار ہو، ایسی صورت میں وہ بات مردود ہوگی اور اُس کی کوئی حیثیت نہیں ہوگی۔
2. وہ بات سند کے اعتبار سے درست ہو لیکن اُسکے اچھی وہ بری دونوں توجیہات ہوں، ایسی صورت میں بالاتفاق اُس بات کی اچھی توجیہ ہی نکالی جائیگی۔
3. وہ سند کے اعتبار سے درست ہو اور اسکی کوئی احسن توجیہ بھی نہ ہو، ایسی صورت میں بھی بالاتفاق اسے صحابی کے اجتہاد اور معقول تاویل پر ہی محمول کیا جائیگا۔(کیونکہ جان بوجھ کر صحابی کا غلط رائے و عمل کو اختیار کرنا ناممکن ہے، اور انکی سیرت وعدالت اس بات کی گواہی دیتی ہیں)۔

اسی طرح یہ جاننا بھی بہت ضروری ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے جو گناہ سرزد ہوئے وہ مندرجہ ذیل پانچ باتوں میں سے کسی ایک سے زائل ہوجائیں گے:

1. یا تو صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اس گناہ سے توبہ کرلی ہوگی، اور یقیناً کی ہوگی کیونکہ وہ سب سے بڑھکر توبہ کی حرص رکھنے والے اور توبہ کرنے والے لوگ تھے، ایسی صورت میں ان پر کوئی گناہ باقی ہی نہیں رہتا کیونکہ رسول اکرم کا فرمان ہے کہ گناہ سے توبہ کرنے والا ایسا ہے جیسا کہ اس نے گناہ کیا ہی نہ ہو۔[2]
2. یا پھر وہ گناہ انکی نیکیوں کے بدلہ میں معاف کردیے جائیں گے، کیونکہ قرآن حکیم میں رب تعالیٰ کا

---

[1] اہل السنہ والجماعۃ اس بات کا عقیدہ رکھتے ہیں کہ اس دنیا میں صرف انبیاء علیہم الصلوٰۃ والتسلیم ہی معصوم ہیں اس معنی میں کہ ان سے گناہ نہیں ہوتے اور انبیاء علیہم السلام کے علاوہ کوئی نہیں کہ جو گناہوں سے معصوم ہو۔

[2] سنن ابنِ ماجه 42/50 و سنن الكبرىٰ للبيهقي 18934

فرمان ہے کہ (نیکیاں، برائیوں کو ختم کر دیتی ہیں) اور بلاشبہ صحابہ کرام کی نیکیوں کے مقابلہ میں اُن کے گناہ آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں، خاص طور پر جب ادنٰی سے صحابی کی نیکی کا اجر بقیہ اُمت کے نیک ترین آدمی کی بڑی سی بڑی نیکی کے اجر کے مقابلہ میں کئی درجہ زیادہ ہو۔ جیسا کہ پیچھے بیان کی گئی حدیث (میرے صحابہ کو برا مت کہو) میں بیان ہوا۔

3. یا پھر انکے گناہ انکے سب سے پہلے اسلام لانے کی وجہ سے معاف کر دیے گئے ہوں۔ کیونکہ یہ عمل بھی گناہوں سے معافی کا ذریعہ ہے۔

4. یا پھر انکے گناہ رسولِ اکرم اُس شفاعت و سفارش کی بدولت ختم کر دیے جائیں گے جو انہیں کل قیامت کے دن حاصل ہوگی، کیونکہ رسولِ اکرم کے فرمان کے مطابق آپکی سفارش اس اُمت کے اُن لوگوں کو حاصل ہوگی جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک نہیں کرتے، یعنی صرف موحدین ہی کو حاصل ہوگی، تو پھر سوچنے کی بات یہ ہے کہ اس اُمت میں صحابہ سے بڑھکر موحدین کی جماعت کون سی ہے اور صحابہ سے بڑھکر آپکی سفارش کا حقدار اور کون ہوگا؟؟ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سب سے بڑھکر اس بات کا حق رکھتے ہیں۔

5. یا پھر انکے گناہوں کو اُن کٹھن اور تکلیف سے بھری آزمائیشوں کے بدلہ میں معاف کر دیا جائیگا جو انہیں دنیا میں اللہ تعالیٰ کے دین اور عقیدہ توحید کی خاطر پہنچیں۔ کیونکہ شریعت کی رو سے آزمائش گناہوں کا کفارہ ہوتی ہے۔

اب ان پانچوں امور کو اپنے سامنے رکھیں اور صحابہ کی سیرت کا مطالعہ کریں آپکو صراحت کے ساتھ سمجھ آجائیگا کہ جو صحابہ سے گناہ سرزد ہوئے وہ ان پانچ امور سے ختم ہو جاتے ہیں۔

﴿آٹھواں قاعدہ﴾

صحابہ کرام کے درمیان جو بھی اختلافات ہوئے اُن میں خاموش رہنا اور اُن میں بحث ومباحثہ سے اجتناب کرنا۔ اس مسئلہ میں تفصیلی کلام ان شاء اللہ اگلی اقساط میں ذکر کیا جائیگا، یہاں صرف اس قاعدہ کو ذہن میں رکھیں اور اتنا سمجھ لیجیے کہ:

یہ مسئلہ دو اہم حصوں پر مشتمل ہے:

❶ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میں آپس میں جو فتنہ و قتال ہوا۔

❷ صحابہ میں چند ایک صحابہ کے مابین جو آپس میں رائے کا اختلاف ہوا۔

ان دونوں معاملات میں اہل السنہ والجماعۃ سلف صالحین کا یہ عقیدہ ہے کہ ان میں کسی بھی قسم کے بحث ومباحصہ میں پڑنے، یا پھر ایک کی حمایت کرکے دوسرے پر تنقید واعتراض کرنے سے اجتناب کیا جائے اور صحابہ کے بارے میں اپنی زبانوں کو بے لگام ہونے سے بچایا جائے۔(کیونکہ انکے درمیان جو کچھ بھی ہوا وہ ان پر ختم ہوگیا اور انکے بعد والوں کے لیے یہ جائز نہیں کہ ان کے بارے میں کوئی بھی ایسی رائے دی جائے کہ جس سے ان پر اعتراض کا ہلکا سے شائبہ بھی ہوسکے۔یہ بات عوام اہل السنہ کے لیے انتہائی قابلِ غور ہے کہ اس امت کے بڑے بڑے اہلِ علم جنکا شمار کتاب وسنت کے متبعین میں ہوتا ہے اور جو اصحابِ محمد ﷺ کے نقشِ قدم پر چلتے ہیں، جو علم کا سمندر اور عمل کا پیکر تھے، جب انہوں نے اس مسئلہ میں کسی قسم کا کوئی بھی کلام کرنے سے اجتناب کیا تو پھر کون ہے جو خود کو اس لائق سمجھے کہ وہ محمدِ الرّسول اللہ کے تربیت یافتہ صحابہ پر کلام کرے؟ اسکے ساتھ ساتھ اہل السنہ سلف کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ کلھم عدول کہ اصحابِ محمد سب کے سب عدالت کے تمام ضابطوں پر پورے اترتے ہیں)۔

﴿نواں قاعدہ﴾

ہر اُس شخص سے بغض وعناد رکھنا اور نفرت کرنا جو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے بغض رکھے، یہ اَصحابِ محمد ﷺ سے محبت کا عملی تقاضہ ہے۔

اس مسئلہ میں تفصیلی کلام ان شاء اللہ اگلی اقساط میں ذکر کریں گے۔

یہاں صرف اس قاعدہ کو ذہن میں رکھیں اور اتنا سمجھ لیجیے کہ ایسا کیسے ہوسکتا ہے کہ آپ کسی ایسے شخص سے محبت ودوستی کریں جو آپکے کسی بھی پیارے سے نفرت وبغض رکھتا ہو؟؟؟

پھر کیسے کوئی ایمان کا دعوے دار اُس شخص سے محبت ودوستی کرسکتا ہے جو اسکے نزدیک سب سے پیارے پیغمبر ﷺ کے سب سے پیارے ساتھی (صحابہ) ہوں، جنکی تربیت خود رسولِ اکرم ﷺ نے کی ہو، جنکی بدولت آج ہمارے رسول ﷺ پر نازل شدہ قرآن کریم اور احادیثِ مبارکہ ہمارے پاس موجود ہیں؟، جن سے رضامندی کا اعلان خود خالقِ کائنات نے کیا ہو یہی نہیں بلکہ جو اصحابِ محمد ﷺ کی احسن طریقہ سے پیروی کریگا

اس سے بھی رضامندی کا اعلان کیا ہو؟ اللہ تعالیٰ تمام مسلمانوں کو سمجھ عطا فرمائے۔

﴿دسواں قاعدہ﴾

صحابہ کرام کی پیروی کرنا اور اور ایمان، ہدایت، منہج ہر مطلوبہ خیر میں انکے نقشِ قدم پر چلنا!

اہلِ عقل و دانش کے یہاں یہ بات مسلم ہے کہ اقتداء و پیروی انکی کرنی چاہیے جو نیک ہوں، جن میں خیر ہو، تو اس دنیا میں پیغمبروں کے بعد جو سب سے نیک ہیں، جو خیر کا مجموعہ ہیں وہ محمد رسول اللہ ﷺ کے صحابہ ہیں، ہر اعتبار سے اقتداء و پیروی کے بھی وہی مستحق ہیں اور انکی پیروی میں دنیاوی و اخروی عزت بھی ہے اور نجات بھی۔

رسولِ اکرم ﷺ کا فرمانِ مبارک ہے: میری سنت و طریقہ اور میری خلفاءِ راشدین کی سنت و طریقہ کو اپنالو اور انتہائی مضبوطی کے ساتھ تھام لو ایسے جیسے کسی چیز کو مضبوطی کے ساتھ داڑھ سے پکڑ لیا جاتا ہے، اور خبر دار! دین میں ایجاد شدہ نئے امور یعنی بدعات سے دور رہو، یقیناً ہر دین میں نئی چیز بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے۔[1]

آخر میں ہم دعا گو ہیں کہ رب تعالیٰ اصحابِ محمّد ﷺ پر اپنی بے شمار رحمتیں نازل فرمائے اور اُمّتِ مسلمہ کو صحابہ کرام سے متعلق مذکورہ تمام حقوق ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

ان شاءاللہ اگلی قسط میں "شریعت میں صحابہ کرام پر سبّ و شتم اور تبرّاء کا حکم"، "صحابہ کے باہمی تنازعات کے حوالہ سے اہل السنہ سلف صالحین رحمہم اللہ کا مؤقف" اور دیگر اہم امور پر مدلّل تحریر قارئین کی خدمت میں پیش کی جائیگی۔



[1] سنن الترمذی 2676 وقال: هذا حديث حسن صحيح، وصححه الألباني, صحيح ابنِ حبان 1/179 ح 5 مستدرک حاکم 174/ 1 ح: 329 وقال هذا حديث صحيح ليس له علة.

جھمیہ اور صوفیہ کے ہاں تصورِ الٰہ۔

صحیح بخاری کی "کتاب التوحید" کی تشریح وتوضیح۔

شیخ العرب والعجم علامہ بدیع الدین شاہ راشدی رحمہ اللہ

مقدمہ: (قسط ۲)

(امام بخاری رحمہ اللہ) کے دور میں جو صفات باری تعالیٰ میں باتیں کیں مثلا: صفات باری تعالیٰ کا بعض لوگوں نے انکار کر دیا، بعض نے اس کا رد کیا اور بعض نے ان کی تاویل کی۔ (اس کی بحث آئندہ سطور میں بیان ہو گی) اس طرح (اس دور کے) لوگوں نے رؤیت باری تعالیٰ کا، نزول باری تعالیٰ کا انکار کیا اور جنت اور جہنم کے پیدا ہونے کا بھی انکار کیا۔ لہذا جب انہوں نے (مبادیات واصول دین) انکار کیا تو لوگوں میں لادینیت کی فضا ہموار ہونے لگی۔ جب جنت جہنم کا انکار ہو گیا تو گویا قرآن مجید (نعوذ باللہ) سب ڈراما ہو گیا۔ وہ جنت جس کا قرآن میں ذکر ہے کہ اس میں نہریں بہتی ہیں، طرح طرح کے فروٹ، حسین و جمیل حوریں ہیں۔ اور دوزخ کے بارے میں بیان ہے کہ اس کی آگ تیز ترین ہے، اس کا پانی بے انتہا گرم ہے اس میں اس طرح کے انواع واقسام کے عذاب ہیں تو اس کو جھٹلانے سے قرآن تو (نعوذ باللہ) ڈرامائی صورت بن گیا۔ کیونکہ قرآن کریم کا اکثر حصہ انہی اصولوں پر مبنی ہے اور جب قرآن ان کے تصور کے مطابق تخیلاتی چیزیں بیان کرتی ہیں تو اس پر ایمان لانا فرض ہی نا رہا۔ بلکہ یہ ایک ذوقی چیز رہ گئی ہاں دل بہلانے کے لئے ہم اسے پڑھ لیتے ہیں۔

جبکہ قرآن مجید میں ہے: ﴿ لَقَدْ كَانَ فِي قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ ۗ مَا كَانَ حَدِيثًا يُفْتَرَىٰ وَلَٰكِن تَصْدِيقَ الَّذِي بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيلَ كُلِّ شَيْءٍ وَهُدًى وَرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ﴿١١١﴾ ﴾ یوسف: ۱۱۱

ترجمہ: ان کے بیان میں عقل والوں کے لئے یقیناً نصیحت اور عبرت ہے، یہ قرآن جھوٹ بنائی ہوئی بات نہیں بلکہ یہ تصدیق ہے، ان کتابوں کی جو اس سے پہلے کی ہیں، کھول کھول کر بیان کرنے والا ہے ہر چیز کو اور ہدایت اور رحمت ہے ایمان دار لوگوں کے لئے۔

یہ ڈرامہ نہیں حقیقت ہے، لوگوں کا اسے ڈرامائی کہنا ان کی دہریت کا سبب بنا جس کی بنا پر صفات باری

تعالیٰ کا انہوں نے انکار کیا۔ آج کے (چند فقہاء) کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو نہ فوق کہو نہ تحت نہ یمین کہو نہ یسار نہ قدام کہو نہ خلف[1]، الغرض باری جل وعلا سے متعلق جہاتِ ستہ کا انکار کر دو۔ اب ذرا اس فکر کے لوگوں سے پوچھو کہ بھئی ذرا معدوم[2] کی تعریف تو کرو۔ جب یہ لوگ معدوم کی تعریف کریں گے تو اس میں بھی یہی کہیں گے کہ لا فوق ولا تحت ولا یمین ولا یسار ولا قدام ولا خلف۔ پھر شیطان نے ان سے اللہ تعالیٰ کی صفات کا انکار کروایا اگر صرف ذات کی پوجا تو ایک بت کی پوجا ہے۔ ذات کو تو آذر اور اس کی جماعت بھی مانتی تھی ان کی بحث بھی صفات میں تھی۔ جب ہی تو ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا تھا کہ:

﴿يَٰٓأَبَتِ لِمَ تَعۡبُدُ مَا لَا يَسۡمَعُ وَلَا يُبۡصِرُ وَلَا يُغۡنِي عَنكَ شَيۡـٔٗا ﴿٤٢﴾﴾ مریم: ٤٢

ترجمہ: ”جب کہ انہوں نے اپنے باپ سے کہا کہ ابا جان! آپ ان کی پوجا پاٹ کیوں کر رہے ہیں جو نہ سنیں نہ دیکھیں؟ نہ آپ کو کچھ بھی فائدہ پہنچا سکیں“۔

(الغرض) ان مشرکین نے ذات کا انکار نہیں کیا کہ کوئی چیز ہی نہیں ہے بلکہ اس ذات کی صفات کا انکار کیا کہ وہ ایک بت ہے۔ لہذا باری تعالیٰ کی صفات کا انکار کا معنیٰ یہ تھا کہ انہوں نے ایک بت بنا لیا اور مسلمانوں کو بھی اس بت پرستی کی دعوت دینے لگے۔ انہیں ذرائع سے مسلمانوں میں یہ افکار در آئے۔

رؤیت باری تعالیٰ جو مسلمانوں کے لئے ایک بہت بڑی عظیم نعمت ہے ان (عقل پرستوں) نے اس کا بھی انکار کر کے مسلمانوں کو ایک عظیم نعمت جس سے بڑھ کر کوئی نعمت نہیں، انہیں اس سے محروم رکھنے کی کوشش کی۔ تو ان (عقل پرستوں) کی یہ تمام باتیں الحاد و دہریت کے مبادیات کے طور پر تھیں اس لئے محدثین کو ضرورت پیش آئی کہ ان باتوں و نظریات کا رد کیا جائے۔

ان نظریات کے علمبر داروں میں سب سے پہلے جہم بن صفوان تھا اور جعد بن درھم جس کو عراق کے گورنر عبد اللہ بن قسری نے عید کے دن ذبح کیا اور کہا کہ ” اے لوگو تم قربانی کرو اللہ تمہاری قربانیاں قبول کرے میں آج جعد بن درہم کی قربانی کروں گا جو کہ اللہ تعالی کی صفات کا انکار کرتا ہے“، اس کے بعد (ان نظریات کا) پرچار بشر مریسی نے کیا۔

ان کی دوسری بات: کلام اللہ سے متعلق تھی کہ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا کلام نہیں ہے بلکہ مخلوق ہے

[1] یعنی نہ اوپر ہے نہ نیچے نہ دائیں نہ بائیں نہ آگے نہ پیچھے۔
[2] ایسی چیز جس کا وجود نہ ہو۔

۔اور (کہا کہ) کلام اللہ صرف وہی ہے جو کلام نفسی ہے۔اور (اس کی توجیہ یہ پیش کی کہ) ہم کلام اللہ کو کلام نفسی اس لئے کہتے ہیں کہ کلام صفت ہے، اور صفت موصوف سے متصل ہوتی ہے اس سے الگ نہیں ہوتی، پھر یہ کلام یہاں کیسے آگیا؟۔حالانکہ (غور کیا جائے تو) یہ بات بالکل غلط ہے۔(بطور مثال دیکھیں) کہ میں یہاں بیٹھا درس دے رہا ہوں آپ اسے ٹیپ (ریکارڈ) کر رہے ہیں۔اب آپ اس کو ہندوستان بھی لے جائیں تو کیا یہ میری ہی آواز نہ ہوگی۔تو یہاں صفت موصوف سے کیسے الگ ہوگئی۔ دنیاوی عقلیات نے بھی اس نظریے کا رد کر دیا ہے لہذا اس (بھونڈے نظریے کی) بنیاد پر انہوں نے قرآن مجید کو مخلوق کہا۔اس فتنے کا سرخیل بشر مریسی تھا۔

بشر مریسی امام ابو یوسف کا شاگرد تھا اس نے بہت بڑا فتنہ کھڑا کیا اور مامون کے دور میں اس کو بڑی شان وشکوت اور قوت ملی۔اس نے جو باطل نظریے اٹھائے ان میں رؤیت باری تعالیٰ اور نزول باری تعالیٰ کا انکار، اور قرآن مجید کو مخلوق کہنا شامل تھا۔اور قرآن کے مخلوق ہونے کے مسئلے کو تو انہوں نے اتنے شد و مد سے اٹھایا کہ اس کی وجہ سے لوگ قتل کئے گئے،(طرح طرح کی سزاؤں میں مبتلا کئے گئے) حالت یہاں تک آن پہنچی کہ لوگوں نے مسجدوں میں آنا چھوڑ دیا جمعہ کی نماز کیلئے بھی مسجد میں نہیں آتے تھے۔

عبد العزیز بن یحی کنانی رحمۃ اللہ علیہ کا (اس مسئلہ پر) بشر مریسی سے مناظرہ ہوا۔مامون کے سامنے بشر مریسی کو شکست فاش ہوئی۔یہ مناظرہ بعد میں کتابی شکل میں منظر عام پر آیا جو کہ "الحیدۃ" کے نام سے کتاب چھپ چکی ہے۔اس کتاب میں پورا واقعہ مذکور ہے: کہ انہوں نے مسئلہ کی ادلہ، کتاب وسنت سے بیان کیں اور اسے ثابت کیا ہے۔اس نے انہیں عقلیات پر لانا چاہا اور کہا کہ یہ تو قرآن کے سوا بات ہی نہیں کرتا عقلیات پر بات کرے تو میں اسے منوالوں۔اس پر مامون نے کہا کہ یہ بات تو غلط ہے کہ ایک آدمی قرآن وسنت پیش کر رہا ہے اور ہم اس کو کہیں کہ تم قرآن وسنت کو چھوڑ کر نظر و قیاس اور عقل کو اختیار کرو۔یہ بات صحیح نہیں ہے۔اس پر عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ:"امیر المؤمنین مجھے اجازت دیجئے اس کا ابھی پتہ چل جائے گا۔! پھر کہا بشر تم بات کروگے یا میں کروں؟" اس نے کہا: تم کرو۔عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ:"اچھا بتاؤ تم کہتے ہو کہ قرآن اللہ کی مخلوق ہے؟"اس نے کہا:"ہاں میں کہتا ہوں"۔عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ نے کہا:"اپنی اس بات پر قائم ہو"اس نے کہا: ہاں قائم ہوں۔عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ نے کہا:" اچھا یہ بتاؤ کہ : "أخلقه في نفسه أم في غيره أم لا في نفسه ولا في غيره" کہ کیا اللہ

تعالیٰ نے قرآن اپنے نفس میں پیدا کیا ہے یا کسی دوسری چیز میں یا پھر نہ اپنے نفس میں اور نہ ہی کسی دوسری چیز میں اس کا مجھے جواب دو"۔ وہ کہنے لگا: اس سے تیرا کیا واسطہ ہے؟ عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ نے کہا :"واسطہ جو بھی ہو سوال کیا ہے اس کا جواب دو مجھے، ادھر ادھر کی باتیں نہ بناؤ، جب تم خود کہہ چکے کہ میں بات کروں تم جواب دو گے تو اب جواب دو، اور جو تمہارا عقیدہ ہے وہ پیش کرو"، مگر وہ خاموش رہا ۔ بالآخر مامون نے کہا کہ: تم جواب کیوں نہیں دیتے اسے؟ کہنے لگا: یہ خوامخواہ بیکار کی بات کر رہا ہے۔ مامون نے کہا: بیکار ہے یا غلط تم جواب تو دو! ، پھر خلیفہ عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ کی جانب متوجہ ہوئے اور کہنے لگے: عبد العزیز: یہ نہیں جواب دے گا اب تم ہی بتاؤ کہ یہ جواب کیوں نہیں دیتا اور اس بات کا جواب کیا ہے؟ اور تمہارا اس بات سے کیا مطلب ہے؟۔ عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: "جناب یہ جانتا ہے کہ وہ اب پکڑا جا چکا ہے، اگر یہ کہتا ہے کہ اللہ نے اسے اپنے اندر اور نفس میں پیدا کیا ہے تو اس کو ماننا پڑے گا کہ اس سے قبل اللہ میں (نعوذ باللہ) نقص تھا جو اس نے پورا کیا یعنی حادث ہوا۔ اگر کسی دوسرے میں پیدا کیا تو اس کا مطلب ہے کہ مخلوق کا کلام اللہ کا کلام ہے، تو حیوان کتے بلے کا کلام اللہ کا کلام ہے (والعیاذ باللہ) ۔ اور اگر یہ کہتا ہے کہ نہ اپنے نفس میں پیدا کیا نہ کسی اور چیز میں تو کلام عرض ہے اور عرض بذاتہ (یعنی بغیر جسم کے) قائم نہیں ہو سکتا!، لہذا یہ جانتا تھا کہ میں پکڑا جا چکا ہوں اس لئے اس نے جواب نہیں دیا"۔ اس طرح اس مناظرے میں اسے شکست ہوئی۔

اسی بشر مریسی کا واقعہ ہے کہ جب یہ مر گیا تو کوئی بھی اس کے جنازے میں نہیں گیا۔ صرف ایک آدمی گیا۔ جب نماز سے فارغ ہوئے تو سب نے مل کر اسے ملامت کیا کہ یہ تم نے یہ کیا کیا؟ وہاں کیوں گئے؟ یہ ضروریاتِ دین کا منکر تھا تم نے اس کا جنازہ کیوں پڑھا؟۔ اس نے کہا کہ مجھے ملامت کرنے سے پہلے مجھ سے سنو تو صحیح کہ میں نے وہاں جا کر کیا کیا؟ انہوں نے پوچھا اچھا کیا کیا؟ اس نے کہا کہ میں نے وہاں جا کر یہ کہا کہ: "اے اللہ یہ بندہ تیری رؤیت کا منکر تھا اسے اپنی رؤیت سے محروم کر دے!۔ یہ تیری جنت کے پیدا ہونے کا انکاری تھا لہذا اسے اس سے بھی محروم کر دینا!۔ یہ میزان کا بھی منکر تھا لہذا اس کا میزان ثقیل نہ کرنا۔ میں نے اس طرح کے الفاظ کہے اور تو کچھ نہیں کہا! "۔

تو یہ ہے محدثین کی جانب سے ان فتنوں کا مقابلہ اسی مقابلے کے طور پر انہوں نے ان فتنوں کے رد میں مختلف کتابیں لکھیں۔

چنانچہ امام بخاری کی ایک اور کتاب " خلق افعال العباد " کے نام سے ہے۔ اس کا تذکرہ اپنے مقام پر آئے گا۔ مگر یہ کتاب بھی اس مسئلے کی کڑی ہے اس میں خلق قرآن کے مسئلے کو واضح طور پر بیان کیا ہے ۔اب بھی (لوگ موجود ہیں) جو کہتے ہیں کہ جو قرآن ہمارے پاس ہے یہ مخلوق ہے اور غیر مخلوق عرش پر ہے ۔ اب جب ان کے سامنے یہ آیت آتی ہے کہ ﴿ فَأَجِرْهُ حَتَّىٰ يَسْمَعَ كَلَٰمَ ٱللَّهِ ﴾التوبة: ٦ یہاں تو صاف کلام اللہ کہا گیا ہے تو یہ وہاں تأویل کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس کا معنٰی یہ ہے کہ: " أي ما يدل عليه كلام الله" یہ اس کا مدلول ہے۔لہذا اسی بنا پر یہ لوگ غیر عربی زبان میں بھی نماز کو جائز قرار دیتے ہیں۔ اب مدلول چاہے عربی میں ہو یا فارسی میں یا کسی اور زبان میں بات تو ایک ہی ہے ۔ لہذا ایسے ہی باطل نظریات ودلائل کی تردید کے لئے (علماء حدیث) نے تصنیفات لکھیں۔ (چند ایک بطور مثال پیش ہیں)

1. ابن ابی حاتم رحمۃ اللہ علیہ کی ''السنة'' اور کتاب ''الرد على الجهمية''
2. احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ''الرد على الجهمية''
3. ابو القاسم اللالکائی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ''السنة''
4. امام صابونی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ''عقائد السلف''
5. امام طبرانی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ''الرد على الجهمية'' اور کتاب ''السنة'' وغیرہ۔

یہ تمام کتابیں ان باطل عقائد کے رد میں ہیں اور ان کا ایک اور مقصد یہ بھی تھا کہ ہمارا عقیدہ قرآن سے مستنبط ہے اور سلف کا عام عمل انہی عقائد پر تھا۔

ایسے ہی باطل عقائد کی تردید کی ضرورت کو سامنے رکھتے ہوئے امام بخاری رحمہ اللہ کو اس کتاب کا یہ عنوان باندھنا پڑا۔

یہاں دوسری بات جو قابل غور ہے وہ یہ کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صحیح (البخاری) میں بالعموم اور اس کتاب التوحید میں بالخصوص یہ کوشش کی ہے کہ اس کتاب کے ہر باب میں اکثر قرآن کی آیتیں پیش کرتے ہیں تاکہ ان (باطل عقائد والوں) کو جواب ملے کہ جن عقائد پر تم اعتراض کرتے ہو وہ صرف خبر (یعنی حدیث) نہیں بلکہ قرآن بھی ہیں ۔ اور اسی بنا پر محدثین رحمہ اللہ کے اقوال بھی ہیں

،جیسا کہ امام بخاری رحمہ اللہ کے شیخ الشیوخ سلام کا قول ہے۔ کہ: ”یہ انکار تو کرتے ہیں مگر ان کی جہالت یہ ہے کہ جتنے بھی مسائل حدیث میں بیان ہوئے ہیں وہ سب قرآن میں مذکور ہیں“۔ جو بھی عقائد ہیں وہ قرآن میں بیان کئے گئے ہیں اب ان لوگوں کا اعتراض قرآن پر ہے حدیث پر نہیں !دراصل حقیقت میں یہ لوگ ان مسائل کو ماننا ہی نہیں چاہتے ورنہ یہ مسائل قرآن میں موجود ہیں: جیسا کہ فرمان باری تعالیٰ ہے: ﴿ قَدْ نَعْلَمُ إِنَّهُۥ لَيَحْزُنُكَ ٱلَّذِى يَقُولُونَ ۖ فَإِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُونَكَ وَلَٰكِنَّ ٱلظَّٰلِمِينَ بِـَٔايَٰتِ ٱللَّهِ يَجْحَدُونَ ﴿٣٣﴾ ﴾الأنعام: ٣٣

ترجمہ:” ہم خوب جانتے ہیں کہ آپ کو ان کے اقوال مغموم کرتے ہیں، سو یہ لوگ آپ کو جھوٹا نہیں کہتے لیکن یہ ظالم تو اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے ہیں“۔

تو یہ ہے حقیقتِ حال اسی بنا پر کتاب التوحید اور ”الرد علی الجهمية“ کا یہاں تذکرہ کیا گیا ہے۔ (ان نظریات کے حامل) باطل فرقے تو بہت ہیں مگر ان میں چند قابل ذکر یہ ہیں۔

❶ قدریہ ❷ جہمیہ ❸ معتزلہ ❹ مرجئہ ❺ روافض ❻ خوارج

یہ بنیادی فرقے ہیں باقی تمام ان کی شاخیں ہیں۔ ہر فرقے کی متعدد شاخیں ہیں، تقریباً اگر ان کو ملا کر شمار کیا جائے تو تعداد تہتر بن جاتی ہے چند لوگوں نے ان فرق کی تعداد کو جمع بھی کیا ہے جیسا کہ عبد القاہر (بغدادی) تمیمی نے ”الفرق بين الفرق“ میں، شیخ عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے ”غنیۃ الطالبین“ میں اور امام ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ نے ”تلبیس ابلیس“ میں اور ابن حزم نے ” الفصل بين الملل والنحل“ میں بیان کیا ہے۔ (ان میں سے ہر مصنف نے) اپنی اپنی معلومات کے تحت ان کے عقائد کو ذکر کیا ہے۔

جہاں تک تعلق مسئلہ توحید کا ہے تو اس مسئلے میں ہمارے سامنے دو بڑے فرقے ہیں جو کہ بالکل ایک دوسرے کے مقابل اور ضد ہیں۔

❶ ایک جہمیہ کا اور ❷ دوسرا صوفیہ کا فرقہ ہے۔ باقی ان کے درمیان میں ہیں کچھ ان سے ملتے ہیں کچھ دوسروں سے۔ بنیادی طور پر یہ دو ہی فرقے ہیں۔

❶ جہمیہ:

جہمیہ کا فرقہ اللہ تعالیٰ کی صفات کا مطلقاً (بالکل) انکاری ہے۔ پھر ان میں سے جو بعض اپنے آپ کو بچانا

چاہتے ہیں کہ کہیں بالکل ہی لوگوں سے کٹ نہ جائیں وہ (باطل) تأویل کا سہارا لیتے ہیں۔ کہتے ہیں جی ہم مانتے ہیں مگر اس کا مطلب کچھ اور ہے۔ یعنی جیسے کہ ان کا کہنا ہے " ید " کا مطلب قدرت، استویٰ کا معنیٰ "استیلاء" اس قسم کی تأویلیں کی گئیں جن کا بیان آگے آئے گا۔ مگر آج کل بھی ایسے لوگ موجود ہیں جو ان تأویلوں کو مانتے ہیں۔ ان مولانا سہارنپوری کی لکھی ہوئی کتاب " المھند علی المفند" دیکھ لیجئے اس میں انہوں نے صاف لکھا ہے کہ صفات کے متعلق ان آیات میں جو سلف کا تفویض کا مسلک ہے ہم تفویض کے قائل ہیں لیکن جو ہمارے اکابر نے ضرورت کی بنا پر ان کی صحیح تأویلیں کی ہیں مثلاً : ید بمعنیٰ قدرت، استویٰ بمعنیٰ استیلاء ہم اس کو بھی صحیح سمجھتے ہیں۔

اب جب جہمیہ نے صفات کا انکار کیا تو گویا (رب کو) انہوں نے (نعوذ باللہ) بت بنا دیا۔ اب جو نہ سنتا ہے، نہ دیکھتا ہے، نہ علم رکھتا ہے تو ہم اس کو کیا کہیں ؟ کیا امیدیں وابستہ رکھیں گے اس کے ساتھ ؟ اب وہ ذات کو کیسے مانتے ہیں ؟ ہم کہتے ہیں کہ ذات صفات کے بغیر مانی ہی نہیں جاسکتی۔ کیونکہ ذات تانیث ہے ذو کی، ذات مضاف ہے اس کا مضاف الیہ کہاں ہے ؟ تو درحقیت ذات صفات پر مضاف ہوتی ہے جب مضاف الیہ کو نہیں مانتے تو مضاف کا معنیٰ کچھ نہیں ہے، جیسے ذو کا کوئی معنیٰ نہیں ہے۔ جہمیہ جو صفات کا کلی انکار کرتے ہیں وہ سب سے بڑی دلیل یہ پیش کرتے ہیں کہ: اگر ہم صفات کو تسلیم کرتے ہیں تو مخلوق کے ساتھ تشبیہ ہوتی ہے کیونکہ مخلوق کی بھی صفات ہیں ! اور اگر تشبیہ ہوگئی تو توحید نہیں رہی۔ لہٰذا توحید یہ ہے کہ اس کی کوئی صفات نہ مانی جائیں۔

ہم پوچھتے ہیں کہ کیا ذات اور وجود کو مانتے ہو ؟ کہتے ہیں ہاں وجود مانتے ہیں۔ تو ہم نے کہا کہ کیا یہ دو نہیں ہوگئے مخلوق کا بھی وجود ہے اور اللہ تعالیٰ کا بھی وجود مان لیا تو کیا یہ دو رب نہیں ہوگئے ؟ لہٰذا اب ان کے پاس اس کے سوا کوئی جواب نہیں کہ یہ کہیں کہ: اللہ تعالیٰ کا وجود اور ہے، اور مخلوق کا اور، یعنی " ذات لیست کالذوات " تو اسی طرح "صفات لیست کالصفات " جس طرح رب تعالیٰ کی ذات دوسروں کی ذات سے ممتاز ہے اسی طرح اس کی صفات دوسروں کی صفات سے ممتاز ہیں۔ ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهِۦ شَىْءٌ ۖ وَهُوَ ٱلسَّمِيعُ ٱلْبَصِيرُ ﴿١١﴾﴾ الشوری: ١١

(ترجمہ:" اس جیسی کوئی چیز نہیں وہ سننے والا اور دیکھنے والا ہے"۔)

تو ان لوگوں نے الجھن پیدا کی اس لئے لوگوں کیلئے یہ مسئلہ مشکل بن گیا۔ آپ نے دیکھا کہ امام رازی نے اپنی پوری عمر کھپادی ان باتوں میں اور آخر کار انہوں نے توبہ کی اور کہا کہ پہلے میں نے علم کلام اور اقوال کے پیچھے اپنی عمر گنوادی اور چند اشعار کہے :

و لم نستفد من بحثنا طول عمرنا * سوى أن جمعنا فيه قيل وقالوا** [1]

(ترجمہ: پوری عمر کی بحث سے ہمیں کچھ حاصل نہیں ہوا، سوائے اس کے کہ ہم نے لوگوں کی باتوں کو جمع کرلیا)

کہنے لگا: اب میں نے دیکھا ہے مجھے قرآن سمجھ میں آگیا ہے کہ مسئلہ بہت آسان ہے۔ لیس کمثلہ شی وھو السمیع البصیر۔ (یعنی) صفات ہیں لیکن ان کا کوئی مثل نہیں۔ اب بات آسان ہے ہم دوسری الجھن میں کیوں پڑیں؟ اس طرح امام غزالی نے بھی پوری زندگی اس میں کھپائی بالآخر انہوں نے توبہ کی اور کتاب لکھی'' الجام العوام عن علم الكلام ''۔ اس میں انہوں نے رد کیا کہ (فلسفہ) میں نہیں مانتا۔ اس طرح امام الحرمین ابو محمد الجوینی کا بھی یہی حال تھا آخر میں انہوں مرتے وقت کہا تھا کہ: میں کیا کروں؟، مجھے لوگوں نے روکا، میں اس معاملہ میں بڑھتا گیا رکا نہیں بالآخر اتنا پھنس گیا کہ کوئی راستہ نظر نہیں آیا اب میرے پاس کہنے کے لئے صرف دو لفظ ہیں کہ: "لولا تداركني ربي فالويل لابن الجويني " اگر میرا رب مجھے نہ بچائے تو پھر ابن جوینی کی ہلاکت ہے۔

ان کے بعد امام ابو الحسن اشعری جنہوں نے چالیس سال اس میں لگا دئے۔ بالآخر اللہ تعالیٰ نے ان سے کام لینا تھا انہیں سمجھ دی۔ وہ کچھ دن اپنے گھر میں بند رہے کم و بیش ہفتہ دس دن غائب رہے اس کے بعد اچانک گھر سے نکلے اور مسجد آکر منبر پر چڑھے اور لوگوں سے کہا کہ دیکھو میں نے اپنی عمر اس طرح گذار دی یہ تمام عقائد غلط ہیں آج میں ان (باطل) عقائد سے توبہ کرتا ہوں اور انہیں اپنے گلے سے اس قمیص کی طرح (اپنی قمیص اتارتے ہوئے کہتے ہیں) اتار پھینکتا ہوں اور آج کے بعد سے میرا یہ عقیدہ ہے۔ انہوں نے تائب ہونے کے بعد کتاب "الابانة" اور "مقالات الاسلاميين" لکھی۔

مگر بعد والے ابھی تک ان کے اس (صحیح عقیدہ) کو نہیں مانتے بلکہ کہتے ہیں کہ "الابانة" کتاب ان کی لکھی ہوئی نہیں بلکہ لوگوں کی بنائی ہوئی ہے۔ حالانکہ بڑے بڑے ائمہ حدیث، ائمہ تاریخ، ائمہ ناقلین

---

[1] درء تعارض العقل والنقل لابن تيمية (89/1)

سب نے اپنی اپنی کتابوں میں ان کی اس کتاب کو ان کی تصنیف شمار کرتے ہیں۔ اور سب کہتے ہیں کہ یہ ان کی آخری تصنیف ہے ۔ امام ابن عساکر نے "تمییز الطیب من الخبیث" میں تفصیل سے یہ واقعہ ذکر کیا ہے۔ مگر بعد والے ابھی تک ان کے قدیم عقیدہ کو لئے ہوئے ہیں۔

2 صوفیہ کا عقیدہ :

یہ تھا جہمیہ کا عقیدہ، جہمیہ کے بعد صوفیہ آئے اور انہوں نے کہا کہ جی صفات کا اگر انکار کریں گے تو قرآن کا انکار ہو گا، قرآن نے صفات کا ذکر کیا ہے، انہوں نے کہا ہم مانیں گے مگر یہ صفات ایسی ہیں جیسی ہماری۔ انسان ان کا مظہر ہے۔ (پھر شاہ صاحب نے کچھ فارسی اشعار پڑھے)

ان اشعار کا مطلب یہ ہے کہ آدم علیہ السلام کے سامنے جب سجدہ کرنے کا فرشتوں کو حکم ہوا تو اللہ تعالیٰ (نعوذ باللہ) ان میں بیٹھا تھا۔ اگر وہ نہ ہوتا تو انسان اور مٹی کو سجدہ کروا رہے تھے۔ ہر چیز میں اللہ انہوں نے مان لیا، یہ ہے صوفیوں کا عمل ۔ تو یہ دو فریق ہیں، ایک دوسرے کے مقابل (جہمیہ) نے صفات کا انکار کر کے (رب کو) بت بنا دیا تھا (والعیاذ باللہ) اور صوفیہ نے صفات رب کو مخلوق سے تشبیہ دے کر سب کو رب بنا دیا۔ (والعیاذ باللہ)

اگر ہم صوفیوں سے پوچھیں کہ اگر کوئی اس الٰہ کا جس کو صوفی مانتے ہیں انکار کرے تو کیا اسے الٰہ کا منکر کہا جائے گا؟ (جواب نہیں میں ہو گا) کہ وہ منکر تو نہ ہوا! اور اگر کوئی صوفیوں کے الٰہ کو مانے تو الٰہ کا ماننے والا بھی نہیں کہلائے گا۔ تو اس طرح یہ دو بڑے فرقے ایک دوسرے کے مقابل ہیں اور ہمارا اہلِ حدیث کا عقیدہ (وسطیت) اور درمیان والا عقیدہ ہے۔

﴿ وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَٰكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِّتَكُونُوا۟ شُهَدَآءَ عَلَى ٱلنَّاسِ وَيَكُونَ ٱلرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا ۗ وَمَا جَعَلْنَا ٱلْقِبْلَةَ ٱلَّتِى كُنتَ عَلَيْهَآ إِلَّا لِنَعْلَمَ مَن يَتَّبِعُ ٱلرَّسُولَ مِمَّن يَنقَلِبُ عَلَىٰ عَقِبَيْهِ ۚ وَإِن كَانَتْ لَكَبِيرَةً إِلَّا عَلَى ٱلَّذِينَ هَدَى ٱللَّهُ ۗ وَمَا كَانَ ٱللَّهُ لِيُضِيعَ إِيمَٰنَكُمْ ۚ إِنَّ ٱللَّهَ بِٱلنَّاسِ لَرَءُوفٌ رَّحِيمٌ ﴿١٤٣﴾ ﴾ البقرة: ١٤٣

ترجمہ: ” ہم نے اسی طرح تمہیں عادل امت بنایا تاکہ تم لوگوں پر گواہ ہو جاؤ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم تم پر گواہ ہو جائیں جس قبلہ پر تم پہلے تھے اسے ہم نے صرف اس لئے مقرر کیا تھا کہ ہم جان لیں کہ رسول کا سچا تابعدار کون ہے اور کون ہے جو اپنی ایڑیوں کے بل پلٹ جاتا ہے گو یہ کام مشکل ہے، مگر

جنہیں اللہ نے ہدایت دی ہے ان پر کوئی مشکل نہیں اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال ضائع نہیں کرے گا اللہ تعالیٰ لوگوں کے ساتھ شفقت اور مہربانی کرنے والا ہے"۔

ہم کہتے ہیں کہ اللہ کی صفات پر ہمارا ایمان اسی طرح ہے جس طرح اس کی ذات پر ایمان ہے۔ اس طرح دو لفظوں میں بات طے ہو گئی۔ جس طرح ہم ذات کے بارے میں نہ تکییف کے قائل ہیں نہ تمثیل کے، نہ تعطیل کرتے ہیں نہ تشبیہ کرتے ہیں، اسی طرح ہم صفات کو مانتے ہیں، اور ان صفات کے ہم قائل ہیں۔ جب اس کی ذات کی کوئی مثال نہیں تو اس کی صفات کی بھی کوئی مثال نہیں۔: لَيْسَ كَمِثْلِهِۦ شَىْءٌ ۖ وَهُوَ ٱلسَّمِيعُ ٱلْبَصِيرُ ﴿١١﴾ الشوری: ١١

ترجمہ: "اس جیسی کوئی چیز نہیں وہ سننے والا اور دیکھنے والا ہے"۔

دوسری طرف قدریہ جبریہ کے مقابل ہیں۔ قدریہ کہتے ہیں تقدیر کوئی چیز نہیں، سب بندے کے اختیار میں ہے۔ (کہتے ہیں) اگر ایسا نہیں ہے تو پھر ثواب اور عقاب کس چیز کی۔ اصل بات یہ ہے کہ ان لوگوں نے ایک طرف کو دیکھا دوسری طرف کو نہیں دیکھا۔ حالانکہ قرآن کریم میں ہے کہ ایک مسلمان کا یہ کام ہے کہ وہ کہے کہ: آمنا بہ کل من عند ربنا۔ مگر (ان کا المیہ یہ ہے کہ) زیادہ تر متشابہات کے پیچھے چلتے ہیں۔﴿ فَأَمَّا ٱلَّذِينَ فِى قُلُوبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُونَ مَا تَشَٰبَهَ مِنْهُ ٱبْتِغَآءَ ٱلْفِتْنَةِ وَٱبْتِغَآءَ تَأْوِيلِهِۦ ۗ ﴿٧﴾ ﴾

ترجمہ: "پس جن کے دلوں میں کجی ہے وہ تو اس کی متشابہ آیتوں کے پیچھے لگ جاتے ہیں، فتنے کی طلب اور ان کی مراد کی جستجو کے لئے"۔

وہ ہمیشہ متشابہات کے پیچھے چلتے ہیں حالانکہ مؤمنین کا کام ہے کہ دونوں پر ایمان رکھتے ہیں۔ وہ اپنی علمی کمی کے معترف ہوتے ہیں۔ تو انہوں نے تقدیر کا انکار کیا کہ بھائی ثواب عقاب کچھ نہیں ہے۔

ایک شخص نے مجھ پر اعتراض کیا اور کہنے لگا سب بات تقدیر ہے! میں نے کہا ہاں۔ (کہنے لگا) پھر عذاب کیوں ہوتا ہے۔ جب تقدیر میں لکھا ہوا ہے تو گناہ کیا؟۔ تو میں نے سوچا کہ اس جاہل کو ایک لمبی تقریر سناؤں بجائے اس کے اس کی لیاقت کا حال اس پہ رکھ دیا جائے۔ میں کہا کہ دیکھو بھائی مجھے کہنے سے تمہیں کوئی فائدہ نہیں ہو گا یہ بات اپنے پاس محفوظ رکھ لو جب اللہ کے سامنے جاؤ گے تو کہنا کہ اللہ یہ تیرا ظلم ہے۔ کیونکہ جب تو نے سب کچھ لکھا ہی ہوا تھا تو پھر ہمیں سزا کیوں مل رہی ہے۔ تو شاید (نعوذ باللہ)

اللہ فرشتوں کو کہے کہ چھوڑو یار اس کو بدنام کر رہا ہے۔ اس پر (وہ کہنے لگا) صاحب ایسا تو نہیں ہو گا میں نے کہا جب ایسے نہیں ہو گا تو پھر اس سوال کا فائدہ کیا؟ میں کوئی فیصلہ کرنے والا تھوڑی ہوں۔ جب اللہ تمہاری بات نہیں سنے گا تو پھر بات پیش کیوں کرتے ہو چپ کرو!

لہٰذا انہوں نے یہ بات اس لئے کہی کہ اللہ پر الزام آئے گا کہ وہ گناہ کرواتا ہے حالانکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ اس چیز کو پسند نہیں کرتا۔

قدریہ کے مقابلے میں پھر جبریہ آ گئے کہنے لگے بندہ کا کوئی اختیار نہیں بلکہ وہ مجبور ہے سب کچھ اللہ کرواتا ہے۔ بندہ کی کوئی چاہت نہیں ہے۔

یہ وہی وجودی والا مسئلہ ہے جو شمع امداد (میں مذکور ہے) جو کہ حاجی امداد اللہ (کی تصنیف ہے) اور یہ صوفیوں کا مرشد ہے، کہتے ہیں کہ ایک آدمی جو ان کی توحید وجودی میں مستغرق تھا، وہاں دور سے ایک ہاتھی آرہا تھا جو اس کی سمت تھا فیل بان اس پر سوار تھا اس نے دور سے آواز دی: یہ (ہاتھی) مست ہے میرے قابو میں نہیں ہے جو لوگ رستے میں ہیں وہ ہٹ جائیں ورنہ کوئی مر گیا تو میں ذمہ دار نہیں، یہ بندہ مست بیٹھا تھا، ہاتھی بان نے کہا ہٹ جاؤ مر جاؤ گے اس پر اس نے کہا کہ بات (دراصل یہ ہے کہ) وہ بھی میں ہوں میں بھی وہ ہوں، وہ بھی وہی ہے میں بھی وہی ہوں خدا کو خدا سے کیا ڈرنا۔ جب اس کے پیر کو پتہ چلا تو کہا دیکھا نا اس نے (مضل) کو تو نہیں دیکھا ہادی کو دیکھا۔ جو بتا رہا تھا وہ ہادی کا مظہر تھا فیل (ہاتھی) وہ مضل کا مظہر تھا وہ ہوا ہادی وہ ہوا مضل یہ بیچارہ کیا کرے! تو ان میں جتنے بڑے ہوتے ہیں اتنے ہی خراب ہوتے ہیں۔

تو یہ (جبریہ) کہتے ہیں گناہ کسی کا نہیں ہے سب کچھ وہی کرواتا ہے۔ ابن فارض کے غالباً شاگرد کا واقعہ ہے کہ: اس کے سامنے جب یہ گفتگو چلی تو اس نے کہا کہ پھر حلال و حرام بھی کچھ نہیں ہے۔ تو پھر چاچے کی لڑکی حلال اور باپ کی حرام کیوں؟ یہاں تک کہ ہر چیز کے بارے میں ان کا یہی کہنا ہے۔ انہوں نے کہا کہ حرام ہمارے نزدیک کوئی فرق نہیں " هؤلاء محجوبون يقولون حرام ونحن لا" یہ جو حجاب میں ہیں یہ کہتے ہیں کہ حلال حرام ہے ہم تو حرام کچھ نہیں مانتے۔ اسی شمع امدادیہ میں واقعہ موجود ہے، جب ان کے پیر نے اس توحید کو بیان کیا تو ان کے ایک شاگرد نہیں کہا کہ: جناب اگر یہ بات ہے تو پھر حلوہ حلال غلیظ حرام کیوں ہے؟ تو اسی وقت پیر نے انسان کی شکل میں حلوہ کھایا اور خنزیر کی شکل میں پاخانہ کھالیا۔

شمع امداد یہ میں ہی ایک اور واقعہ ہے: ان کا ایک مرید حج پر جارہا تھا راست کو جہاز کو طوفان نے آگھیر اوہ بڑے پریشان ہوئے وہاں ایک مرید نی تھی اس کو اونگھ آگئی خواب میں دیکھا کہ ان کے دو پیر ہیں ایک تو وہی جس کے ساتھ بات کر رہا ہے وہ دونوں اس جہاز کو کندھا دے کر نکال رہے ہیں۔ چنانچہ دوسرے دن دیکھا کہ جہاز پہنچ گیا تو پیر کو یہ قصہ سنایا تو پیر نے کہا کہ: بابا فاعل حقیقی تو وہ ہے لیکن بعید نہیں کہ وہ کسی اور کی شکل میں آکر کام پورا کر دے۔

یہ دونوں گروہ ایک دوسرے کے مقابل ہیں انہوں نے ایک رخ دیکھا دوسرا نہیں دیکھا۔ قدریہ نے عذاب وعقاب کی آیات کو دیکھا اور تقدیر کے دلائل کو نہیں دیکھا اس لئے تقدیر کا انکار کیا۔ جبریہ نے تقدیر کے دلائل کو دیکھا اور ثواب وعقاب کی آیات ودلائل کو نہیں دیکھا اس لئے اسی کو لے لیا۔ یہ دونوں گروہ غلطی پر ہیں۔ ہمارا(اہل السنۃ) کا دونوں پر ایمان ہے۔ یعنی ثواب وعقاب پر بھی ہمارا ایمان ہے تو اللہ کی تقدیر کے بھی ہم قائل ہیں۔ ہم دونوں چیزوں پر ایمان رکھتے ہیں کہ جو کچھ قرآن نے کہا" وہ سچ ہے " يَقُولُونَ ءَامَنَّا بِهِۦ كُلٌّ مِّنۡ عِندِ رَبِّنَاۗ وَمَا يَذَّكَّرُ إِلَّآ أُوْلُواْ ٱلۡأَلۡبَٰبِ ﴿٧﴾ ﴾آل عمران: ۷۔

ترجمہ: "ہم تو ان پر ایمان لاچکے ہیں، یہ ہمارے رب کی طرف سے ہیں اور نصیحت تو صرف عقلمند حاصل کرتے ہیں"۔ ہم الجھنیں نہیں پیدا کرتے۔

اس کی مثال آدم علیہ السلام اور موسیٰ علیہ السلام کا مناظرہ ہے۔ جو کہ آپ نے حدیث میں پڑھا ہوگا۔ "فحج آدم موسی'' آپ خود دیکھئے کہ موسیٰ علیہ السلام کے سامنے تقدیر کا اظہار کیا کہ یہ تقدیر کا مسئلہ ہے۔ مگر جب اللہ تعالیٰ کی جانب سے خطاب ہوا: وَنَادَىٰهُمَا رَبُّهُمَآ أَلَمۡ أَنۡهَكُمَا عَن تِلۡكُمَا ٱلشَّجَرَةِ وَأَقُل لَّكُمَآ إِنَّ ٱلشَّيۡطَٰنَ لَكُمَا عَدُوّٞ مُّبِينٞ ﴿٢٢﴾ ﴾ الأعراف: ۲۲۔

ترجمہ:"اور ان کے رب نے ان کو پکارا کیا میں نے تم دونوں کو اس درخت سے منع نہ کر چکا تھا اور یہ نہ کہہ چکا کہ شیطان تمہارا صریح دشمن ہے"۔

تو آدم علیہ السلام نے یہ نہیں کہا کہ میں نے نہیں کھایا۔ بلکہ کہا ﴿ قَالَا رَبَّنَا ظَلَمۡنَآ أَنفُسَنَا وَإِن لَّمۡ تَغۡفِرۡ لَنَا وَتَرۡحَمۡنَا لَنَكُونَنَّ مِنَ ٱلۡخَٰسِرِينَ ﴿٢٣﴾ ﴾الأعراف: ۲۳

ترجمہ: ’’دونوں نے کہا اے ہمارے رب ! ہم نے اپنا بڑا نقصان کیا اور اگر تو ہماری مغفرت نہ کرے گا اور ہم پر رحم نہ کرے گا تو واقعی ہم نقصان پانے والوں میں سے ہو جائیں گے‘‘۔

تو تقدیر کا معاملہ عقیدہ کے ساتھ ہے تقدیر حجت بنانے کیلئے نہیں ہے۔ یعنی تقدیر احتجاج اور استدلال کی چیز نہیں ہے، کہ ہم اس کو دلیل بنائیں۔ ایک ملزم چوری، یا زنا یا ڈکیتی کی واردات میں پکڑا جائے اور یہ جرم اس پر ثابت ہو جائے۔ جج اس کو سزا دیتا ہے۔ اگر وہ جج کے سامنے یہ کہے کہ میں کیا کروں میری تقدیر میں یہ لکھا ہوا تھا۔ تو کیا جج اس کو چھوڑ دے گا۔ یہ بات تو اس نے صحیح بولی ہے مگر تقدیر چونکہ استدلال اور دلیل بنانے کی چیز نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق محض عقیدہ سے ہے۔ لہٰذا ہم اہل حدیث ان دونوں گروہوں کے وسط میں ہوئے کہ ہم نے تقدیر پر بھی ایمان رکھا اور بندوں کو مجبور بھی قرار نہیں دیا۔ (جاری ہے)



درخواست برائے دعاء صحت یابی

گزشتہ دنوں جماعت اہل حدیث کے نامور علماء دین **فضیلۃ الشیخ ابرہیم بھٹی** حفظہ اللہ اور **فضیلۃ الشیخ طالب الرحمن شاہ** حفظہ اللہ عارضہ قلب میں مبتلا ہوئے۔

تمام قارئین کرام سے دونوں علماء دین کی صحتیابی کے لئے خصوصی دعاؤں کی درخواست ہے۔

اللہ تعالی ہم پر علماء دین کا سایہ بر قرار رکھے، اور تمام امت کو ان کے علم سے استفادہ کی توفیق عطاء فرمائے۔

(ادارہ)

تواترِ عملی کی آڑ میں انکارِ حدیث کا نیا انداز

ابو عمر حافظ سلیم [1]

اہل علم اور علمی ذوق رکھنے والوں پر یہ امر مخفی اور محتاجِ بیان نہیں ہے کہ روز بروز باطل عقائد ونظریات کے حاملین لوگ مختلف حیلے بہانے سے صحیح حدیث کو عوام الناس میں مشکوک ومشتبہ بنانے کی سعی لاحاصل میں مصروف ہیں۔ ایسا کرتے ہوئے یہ لوگ کیوں بھول جاتے ہیں کہ یہ نہ تو دین کی خدمت ہے نہ عوام الناس کے ساتھ بھلائی ہے جس کا آخرت میں کوئی بہتر صلہ مل سکے، بلکہ یہ تو سراسر گھاٹے اور نقصان کا سودا ہے لیکن اپنی دنیا کو بہتر بنانے کے لیے اپنی آخرت کو بگاڑنے والے شاید اس احساس وادراک سے بہت دور ہیں۔ فرمانِ باری تعالیٰ تو بڑی صداقت کے ساتھ اعلان کررہا ہے:

﴿ وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهِۦٓ أَنفُسَهُمْ ۚ لَوْ كَانُوا۟ يَعْلَمُونَ ﴿١٠٢﴾ ﴾ البقرة: ١٠٢

ترجمہ: ”اور وہ بدترین چیز ہے جس کے بدلے وہ اپنے آپ کو فروخت کر رہے ہیں، کاش کہ یہ جانتے ہوتے“۔

آئے دن منکرینِ حدیث اور ان کے ہم نوا عجیب وغریب انداز میں احادیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر اعتراضات کرتے ہیں، اعتراضات میں نہ کوئی معقولیت ہوتی ہے اور نہ ہی علمیت بلکہ پرانے ہی اعتراضات کو جدید رنگ میں پیش کرکے اسے بڑی ریسرچ وتحقیق کا نام دیتے ہیں، یوں اہل علم میں اپنا مذاق بھی خود ہی اڑادیتے ہیں اور اپنی جہالت کو بھی آشکار کرتے ہیں۔

اب تک حدیث کا انکار کرنے والوں کے رد میں علماء أھل السنة کی طرف سے تحریراً وتقریراً، علمی، تحقیقی وتنقیدی ہر پہلو سے اس قدر اور اتنا لکھا جاچکا ہے کہ کوئی شبہ یا اعتراض منکرین ومتحرفین کی طرف سے باقی نہیں رہتا۔ بلکہ علماء نے نہ صرف یہ کہ ان شبہات کا ازالہ کیا بلکہ خود ان کی (منکرینِ حدیث) اصطلاحی، اصولی، تحقیقی اور فنی خامیوں کے ذکر کے ساتھ ساتھ علمی خیانتوں کو بھی طشت ازبام کیا۔ اس

---

[1] شیخ الحدیث المعہد السلفی للتعلیم والتربیہ کراچی، مفتی المدینہ اسلامک ریسرچ سینٹر

کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ یہ فتنے عرصہ ٔدراز تک ٹھنڈے پڑ گئے کیونکہ انہوں نے جان لیا کہ اب ہمارا بھانڈا بیچ چوراہے پھوٹ چکا ہے۔ یہاں راقم کا یہ دعویٰ ہے کہ اگر منکرینِ حدیث، حدیث دشمنی ترک کرکے اس مواد کا مطالعہ کریں تو یقیناً یہ مطالعہ ان کی دنیا وآخرت کو بہتر بنانے کے حوالے سے مفید ہوگا۔ سچ ہے:

ایں سعادت بزور بازو نیست

بہر حال علماء کے مسلسل جوابات کے بعد یہ فتنے بھی مسلسل نئے رنگ وروپ کے ساتھ مختلف طریقوں سے منظر عام پر آنے کی کوشش کرتے ہیں، اور چونکہ ہمارا حکمران طبقہ عام طور پر دین سے بیزار اور روشن خیال ہوتا ہے یوں حکمرانوں پر دین کا رنگ غالب نہ ہونے کی وجہ سے انہیں مزید سپورٹ (Support) ملتی رہتی ہے۔ اور یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔

ابھی کچھ عرصہ قبل ہمارے سینٹر المدینہ اسلامک ریسرچ سینٹر میں ایک ساتھی دو تین صفحات پر مشتمل ابو الارقم الانصاری کا ایک مضمون بنام: ''قرآن وسنت: اساسِ اسلام اور مقامِ حدیث'' لیکر آئے جو انہیں نیٹ پر موجود ایک ویب سائٹ سے ملا تھا۔ تحریر میں مضمون نگار کو یہ تسلیم ہے کہ دین اسلام کی اساس قرآن وسنت پر ہے جس کے لیے انہوں نے قرآن مجید کے مختلف مقامات سے جہاں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کا ذکر ہے انہیں ذکر کیا اور اس طرح جہاں محمد رسول اللہ ﷺ کی اتباع کا ذکر تھا۔ قارئین ان کی عبارت ملاحظہ فرمائیں:

''''لہٰذا دین اسلام میں قرآن اور سنت دونوں ہی لازم وملزوم ہیں یہ ہی وجہ ہے کہ قرآن وحکیم میں کم از کم گیارہ (11) مقامات پر یہ وضاحتی حکم بھی دیا گیا ہے کہ اللہ کی بھی اطاعت کرو اور اللہ کے رسول ﷺ کی بھی اطاعت کرو۔ ملاحظہ کریں قرآنی آیات: سورۂ آل عمران: (32)، سورۂ نساء:(13)، سورۂ نساء:(59)، سورۂ انفال:(93)، سورۂ نور: ۔، سورۂ محمد:(54)، سورۂ مجادلہ: (13)، سورۂ تغابن: (12)''۔

مزید لکھتے ہیں: ''قرآن مجید میں تمام احکام اصولی طور پر موجود ہیں لیکن ان کی تفصیل رسول اللہ ﷺ کے ذمہ ہے اس کی مثالیں نماز، روزہ، زکاۃ اور حج کے مسائل کے باب میں دیکھی جاسکتی ہیں''۔

یہاں تک موصوف کا فہم صحیح ہے، پھر اس فہم میں کجی اس وقت پیدا ہوئی جب موصوف یوں گویا

ہوئے: ''سنت کی مستحکم بنیاد روایت کردہ یا نقل کردہ احادیث پر نہیں ہے بلکہ شروع سے امت اسلامیہ کے عملی تواتر پر ہے''۔

جبکہ موصوف کو یہ بھی تسلیم ہے کہ: '' قرآن کے اجمالی احکامات کی تفصیلی و عملی تعلیمات اللہ نے اپنے رسول ﷺ کے سپرد کر دی تھیں تاکہ وہ ان پر خود عمل کرتے ہوئے امت کے لوگوں کو بھی اپنی ہر عملی سنت پر ٹھیک اسی طرح عمل کرواسکیں۔ چنانچہ نبی کریم ﷺ نے ایسا ہی کیا: مثلاً نماز کی ہیئت اور اس کے تمام لوازمات (قیام، رکوع، سجود، جلسہ اور سلام وغیرہ اوران میں مقررہ کلمات کی ادائیگی) اپنی ذات پر اور اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم پر اللہ کے بتائے ہوئے طور طریق کے مطابق قائم کر دیئے۔ اس طرح سنت رسول اللہ ﷺ کے ذریعے نماز کی مکمل صورت گری ہو گئی''۔ (اس جگہ نبی کریم ﷺ کا طریقہ ہی حجت بنا اور اسی کا نام حدیث یا سنت ہے)۔

اس عبارت کو بغور پڑھنے پر اہمیت حدیث اور حجیت حدیث ہر قاری پر واضح ہو جاتی ہے جو موصوف دانستہ یا نادانستہ لکھ بیٹھے ہیں۔ مگر بہت جلد موصوف نے پلاننگ کے مطابق حدیث پر حملے شروع کر دیئے چنانچہ حجیت حدیث پر حملہ ان الفاظ میں کیا: ''سنت کی مستحکم بنیاد روایت کردہ یا نقل کردہ احادیث پر نہیں ہے''۔

اور پھر ایک نیا فلسفہ منظرِ عام پر لاتے ہوئے گویا ہوئے:

''پھر یہی سنت (یعنی نبی ﷺ نے جو عمل کر کے صحابہ کو دکھایا) پورے تسلسل و تواتر کے ساتھ دورِ نبوت ﷺ سے دورِ صحابہ میں جوں کی توں منتقل ہو گئی، جہاں سے یہ اگلے دور تابعین پھر دورِ تبع تابعین اور پھر نسل در نسل منتقل ہر کر آج تک من و عن جاری ہے، اسی کا نام سنت تواتر یا سنتِ متواترہ ہے جو تا قیامت بغیر کسی تبدیلی کے جاری و ساری رہے گی''۔

موصوف نے اس عبارت میں یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ حدیث کچھ بھی نہیں بس پورا کا پورا اسلام مذکورہ بالا طریقے سے ہم تک پہنچا ہے۔

نیز موصوف لکھتے ہیں کہ: ''تا قیامت بغیر کسی تبدیلی کے جاری و ساری رہے گی''۔

یہ پڑھ کر ایسا لگتا ہے کہ موصوف موجودہ و گزشتہ تبدیلیاں جو کی گئیں اس سے بالکل ہی جاہل و نا آشنا ہیں

یا پھر تجاہلِ عارفانہ کے ذریعے عوام کو دھوکہ دے رہے ہیں۔

حدیث کی حجیت کا معیار یہ پیش کیا ہے کہ وہ قرآن کے، عقل کے اور امت کے عملی تواتر کے خلاف نہ ہو، اس سلسلہ میں انہوں نے تین روایتیں نقل کی ہیں اور بزعم خود انہیں قرآن، عقل اور امت کے تواتر کے خلاف سمجھا۔ اور پھر یہ نتیجہ نکالا کہ یہ حدیثیں قابلِ اعتبار نہیں۔ موصوف نے اپنے مضمون میں ایک نئ اصطلاح بھی متعارف کرائی ہے اور وہ ہے "عملی تواتر"۔ جیسا کہ وہ تحریر کر چکے ہیں کہ سنت کی مستحکم بنیاد روایت کردہ یا نقل کردہ احادیث پر نہیں ہے بلکہ شروع سے امت اسلامیہ کے عملی تواتر پر ہے۔

اب موصوف کو یہ کون سمجھائے کہ آپ نے سبق ہی الٹا یاد کیا ہے، جس عمل میں آپ تواتر دکھانا چاہتے ہیں اس ثبوت کی نسبت کس کی طرف ہو گی؟ ظاہر ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی طرف۔ تو پھر حجیت تو قولِ رسول ﷺ اور فعلِ رسول ﷺ ہوا نہ کہ امتِ اسلامیہ کا عملی تواتر۔

کاش کہ آپ نے کتب احادیث کا مطالعہ گہرائی و گیرائی سے کیا ہوتا تو آپ کو پتہ چلتا کہ اس بات میں کوئی وزن نہیں ہے، اب اگر کوئی شخص نماز کے طریقہ پر اعتماد کی بنیاد اس چیز کو بنائے کہ مسلمانوں کی اکثریت اس طرح ادا کرتی ہے، تو یہ کوئی شرعی دلیل نہیں ہے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ، جامع ترمذی میں جابجا تحریر کرتے ہیں: "وبه يقول أكثر أهل العلم من أصحاب النبى صلى الله عليه وسلم والتابعين ومن بعدهم ".

"اس حدیث پر اکثر صحابہ و تابعین کا عمل ہے"۔

کبھی یوں فرماتے ہیں :"وبه يقول بعض أهل العلم من أصحاب النبى صلى الله عليه وسلم والتابعين ومن بعدهم".

"اس حدیث پر بعض اصحابِ نبی ﷺ اور (بعض) تابعین رحمہم اللہ کا عمل ہے"۔

کثرت و قلت میں استنادی حیثیت قول رسول ﷺ اور فعلِ رسول ﷺ کو ہی حاصل ہے۔ مسئلہ رفع الیدین ہی کو دیکھ لیجئے، امام بخاری رحمہ اللہ جزء رفع الیدین میں فرماتے ہیں کہ تمام صحابہ عامل رفع الیدین تھے، سوائے اہل کوفہ کے کوئی بھی ترک کا قائل نہ تھا۔ اب آپ کیا کہیں گے؟ کہاں گیا یہ تواتر؟۔

جناب! یہ تواتر عملی والی سنت کی تعریف آپ نے کہاں سے اخذ کی؟، کسی ایک معتبر کتاب کا حوالہ تو دیں،

محدثین کی ایک کثیر تعداد میں سے کسی ایک کا صحیح اور مستند حوالہ یا اصول حدیث میں کہیں اس کا کوئی ثبوت ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ بھی غامدی صاحب کی طرح" ماڈرن ڈکشنری" کی ایجاد ہو۔ انہوں نے سنت کی تعریف یہ کی ہے کہ" جو ابراہیم علیہ السلام کے وقت سے تواتراً امت محمدیہ تک چلی آرہی ہو"۔ علمی دنیا میں اس قسم کے شور شرابہ کا کوئی وزن نہیں ہے۔ ایسے لوگوں کا علمی میدان میں اور اہل علم کے نزدیک کیا مقام و مرتبہ ہے شاید آپ نہیں جانتے۔ آپ نے اس سلسلہ میں ان کی شاگردی کرنے کی سعیِ لا حاصل کی ہے، آپ کی اپنی گھڑی ہوئی تعریف کی ملتِ اسلامیہ کا عملی تواتر تکذیب کررہاہے۔ اس پر آپ نے سنجیدگی سے غور کیا؟ نماز ہی کے مسائل کو دیکھ لیجئے، مثلاً: مسلمانوں کی اکثریت وضو میں گردن کا مسح کرتی ہے۔ نماز میں نیت زبان سے کرتی ہے ۔ روزے کی نیت زبان سے کرتی ہے۔ نمازِ جنازہ کی نیت زبان سے کرتی ہے ۔ بیک وقت تین طلاقوں کا نافذ ہونا۔ تراویح میں 20 رکعت کا پڑھنا۔ تو کیا یہ اعمال درست ہوسکتے ہیں؟ اگر نہیں تو اس لیے نہیں کہ رسول اللہ ﷺ سے اس کا ثبوت نہیں ہے۔

اگر کسی مسئلہ میں لوگوں کی اکثریت دور صحابہ سے عامل ہو اور اللہ کے نبی سے وہ چیز ثابت نہ ہو تو بتائیے اس کی شرعی حیثیت کیا ہوگی؟ یقیناً شرعاً اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ یا وہ اللہ کے نبی ﷺ سے ثابت ہو اور پھر کسی بھی دور میں اس پر عمل کرنے والے زیادہ ہوں یا تھوڑے ہوں تب بھی نبی ﷺ کے فرمان کی حیثیت مشکوک نہیں ہوگی اگر وہ اصول حدیث کی رو سے باسند صحیح ثابت ہو، کیا اللہ کے نبی ﷺ کا یہ فرمان ہمارے مذکورہ بالا دعوے کی تصدیق نہیں کررہا:

حدثنا محمد بن عباد وابن أبي عمر جميعا عن مروان الفزاري قال ابن عباد حدثنا مروان عن يزيد يعني ابن كيسان عن أبي حازم عن أبي هريرة قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم :بدأ الإسلام غريبا وسيعود كما بدأ غريبا فطوبى للغرباء.[1]

"ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اسلام شروع میں اجنبی تھا اور پہلے کی طرح دوبارہ اجنبی ہوجائے گا، لہٰذا اجنبیوں کے لیے خوشخبری ہے"۔

[1] صحیح المسلم: 208، سنن ابن ماجه: 3976

حدثنا عبد الله بن عبد الرحمن أخبرنا إسمعيل بن أبي أويس حدثني كثير بن عبد الله بن عمرو بن عوف بن زيد بن ملحة عن أبيه عن جده أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال إن الدين ليأرز إلى الحجاز كما تأرز الحية إلى جحرها وليعقلن الدين من الحجاز معقل الأروية من رأس الجبل إن الدين بدأ غريبا ويرجع غريبا فطوبى للغرباء الذين يصلحون ما أفسد الناس من بعدي من سنتي۔قال أبو عيسى هذا حديث حسن [1]

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:" دین حجاز کی طرف اس طرح سمٹ جائے گا جس طرح سانپ اپنے سوراخ (بِل) میں داخل ہو جاتا ہے"۔

ان فرامین پر غور کیجئے، ان شاء اللہ یہ جو وساوس ہیں سب دور ہو جائیں گے، آپ کی علمی یتیمی کا حال یہ ہے کہ آپ نے جو دعویٰ کیا ہے اور جو اصول وضع کیا ہے سلف میں سے صحابہ میں سے، تابعین میں سے، تبع تابعین میں سے عملی تواتر کے ساتھ کون اس کا قائل یا فاعل ہے؟؟؟ اگر ایسا ہوتا تو آپ کو یہ گھڑنے کی ضرورت پیش نہ آتی۔

جہاں تک اس مضمون میں تحریر کردہ تین حدیثوں کے حوالے سے بحث کی گئی ہے جن میں سے ایک کو قرآن کے اور دوسری کو تواتر عملی کے اور تیسری کو عقل کے خلاف بتایا گیا ہے ہم اس کو بقدرِ ضرورت تفصیل سے تحریر کرتے ہیں تاکہ صحیح حقیقت قارئین کے سامنے آجائے۔ خود مضمون نگار بھی ہمارے حسن ظن کے مطابق صحیح حقیقت سے بے خبر ہے کیونکہ اگر وہ پڑھے لکھے ہوتے تو سنی سنائی باتوں پر اعتماد کرنے والے نہ ہوتے اور یقیناً وہ حوالے میں ذکر کردہ حدیث کو بھی مکمل ذکر کرتے۔

مضمون نگار کا حدیث کو مکمل ذکر نہ کرنا قرآن کی آیت کا صحیح ترجمہ نہ کرنا (جیسا کہ آگے وضاحت آرہی ہے) ان کے مبلغِ علمی کو واضح کرتا ہے۔

حدیث ❶:

جس حدیث کو انہوں نے قرآن کے خلاف کہا ہے پہلے ہم اس حدیث کو بمع سند و متن درج کریں گے اور پھر اس کا ترجمہ پیش کریں گے اس کے بعد جو مضمون نگار کو اس حدیث کا قرآن کے خلاف ہونا نظر آرہا

[1] صحیح سنن الترمذی: 2554، صحیح البخاری: 1743، صحیح المسلم: 210، سنن ابن ماجہ: 3102

ہے اسے بتوفیق اللہ تعالیٰ وعونہ واضح کریں گے۔

حدثنا قبيصة بن عقبة حدثنا سفيان عن هشام بن عروة عن عروة تزوج النبي ﷺ عائشة وهي بنت ست سنين وبنى بها وهي بنت تسع ومكثت عنده تسعا [1]

یعنی: " آپ ﷺ نے عائشہ رضی اللہ عنہا سے چھ (6) سال کی عمر میں نکاح کیا اور نو (9) سال کی عمر میں (عائشہ رضی اللہ عنہا کی) رخصتی ہوئی"۔

☆ اس روایت کو بمع سند و متن صحیح بخاری سے ذکر کرنے کا مقصد یہی تھا کہ سب سے پہلے مضمون نگار اپنے دعویٰ کے مطابق ہمیں اس حدیث میں وہ راوی دکھائیں جو بقول ان کے یہودی ہیں یا منافقین ہیں جیسا کہ وہ اپنے مضمون میں تحریر کرتے ہیں کہ: "یہ گند اور گھپلا یہودی اور منافقین نے خاتم النبیین ﷺ کو بدنام کرنے کے لیے کیا ہے"۔

محدثین کی جماعت میں سے کس محدث نے ان راویوں پر جرح کی ہے؟، اسماء الرجال کی کتب سے ذرا ان رواۃ کی نشاندہی کریں۔(قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ﴿١١١﴾ البقرة

"اگر تم سچے ہو تو دلیل سے بات کرو"۔

کیا ان دعوؤں کی حیثیت صرف جھوٹے دعووں کی نہیں ہے؟ کیا آپ کا دامن اس حوالے سے دلائل سے خالی نہیں ہے؟ ائمہ محدثین میں سے کوئی ایک محدث، ائمہ جرح وتعدیل میں سے کوئی ایک امام، ائمہ اصولیین میں سے کوئی ایک امام ایسا ہے جو آپ کا اس مسئلہ میں ساتھ دیتا نظر آتا ہو؟ یہ سارا تواتر تو آپ کے خلاف جارہا ہے۔ تو پھر نتیجتاً یہ کہنا آسان ہو جاتا ہے کہ آپ ان تمام محدثین کرام واصولیین کی نظر میں مخالفین دین وشریعت طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ جبکہ آپ کے نزدیک حق وانصاف کا پیمانہ اس کے برعکس ہے آپ معاذ اللہ ان سب کو غلطی پر باور کروا رہے ہیں۔

☆ دوسری بات روایت کو مکمل درج کرنے سے یہ بھی واضح کرنا مقصود ہے کہ مضمون نگار نے اس جگہ بدترین علمی خیانت کا ارتکاب کرتے ہوئے لکھا: "پہلی مثال بخاری اور مسلم کی یہ متفق علیہ

---

[1] صحيح البخاري: 3605، 3607، 4738، 4739، 4761

حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے 6 سالہ (نابالغہ) حضرت عائشہؓ سے نکاح کیا تھا بخاری کتاب مناقب انصار"، اور اب روایت کو مکمل تحریر کرنے سے واضح ہو گیا ہے کہ نکاح کے موقع پر سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی عمر 6 سال تھی جبکہ رخصتی کے موقع پر ان کی عمر 9 سال تھی اس آخری حصہ کو مضمون نگار نہ جانے کیا سمجھ کر پی گئے، خیر ایسے لوگ سے کوئی شکوہ بے معنی ہے ویسے عوام کو حقائق دکھانا ہمارا فرض تھا اور وہ باللہ التوفیق ہم نے ادا کرنے کی کوشش کی۔

یہ روایت صحیح بخاری اور صحیح مسلم کے علاوہ بھی کئی کتب میں موجود ہے۔

اب ہم ذرا سرسری طور پر ان روایات کا جائزہ لیتے ہیں جن سے صراحۃً یا اشارۃً یہ بخوبی واضح ہوتا ہے کہ نکاح ور خصتی کے موقع عائشہ رضی اللہ عنہا کی عمر زیادہ نہ تھی، مثلاً:

1. امام ابن ماجہ نے باب نکاح الصغار یزوجهن الآباء (باب اس بیان میں کہ والدین اپنے بچوں کا چھوٹی عمر میں نکاح کر دیں) کے تحت عائشہ رضی اللہ عنہا کے نکاح کے بارے میں جو روایت نقل کی ہے اس میں عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے: عن عائشة قالت تزوجني رسول الله صلى الله عليه وسلم وأنا بنت ست سنين ... فأسلمتني إليه وأنا يومئذ بنت تسع سنين [1]

یعنی:" وہ فرماتی ہیں کہ نکاح کے وقت میری عمر 6 سال اور رخصتی کے وقت 9 سال تھی"۔

2. اسی طرح صحیح بخاری، صحیح مسلم اور سنن النسائی میں عائشہ رضی اللہ عنہا کا یہ بیان:

حدثنا عبد الله بن محمد حدثنا هشام أخبرنا معمر عن الزهري عن عروة عن عائشة قالت :"كان الحبش يلعبون بحرابهم فسترني رسول الله صلى الله عليه وسلم وأنا أنظر فما زلت أنظر حتى كنت أنا أنصرف فاقدروا قدر الجارية الحديثة السن تسمع اللهو۔"

"میں آپ ﷺ کے پیچھے کھڑی حبشیوں کا کھیل دیکھ رہی تھی۔ اور میں دیکھتی رہی یہاں تک کہ میں خود وہاں سے ہٹی اب تم خود سمجھ لو کہ ایک کم عمر لڑکی کھیل کو کتنی دیر تک دیکھ سکتی اور اس میں دلچسپی

---

[1] نیز اسی معنی میں دیکھئے؛ سنن النسائی: 3326، صحیح المسلم: 2548۔

لے سکتی ہے"۔

(فاقدروا قدر الجارية الحديثة السن تسمع اللهو) **اب تم خود سمجھ لو کہ ایک کم عمر لڑکی کھیل کو کتنی دیر تک دیکھ سکتی اور اس میں دلچسپی لے سکتی ہے۔** [1]

3. اسی طرح واقعہ افک میں عائشہ رضی اللہ عنہا کا یہ کہنا کہ: فقلت وأنا جارية حديثة السن [2] "اور میں نو عمر لڑکی تھی"۔

4. مسئلہ تخییر میں آپ ﷺ کا عائشہ رضی اللہ عنہا کو یہ کہنا کہ: "إني ذاكر لك أمرا فلا عليك أن لا تستعجلي حتى تستأمري أبويك وقد علم أن أبوي لم يكونا يأمراني بفراقه" [3]

"یعنی میں تمہیں ایک اختیاری حکم دیتا ہوں لیکن تم اپنے والدین سے مشورہ کیے بغیر جواب نہ دینا"۔

کیا اس سے یہ واضح نہیں ہوتا کہ کہیں وہ اپنی کم سنی کی وجہ سے کوئی غلط فیصلہ نہ کر بیٹھے۔ کیونکہ عائشہ رضی اللہ عنہا بھی اس خدشے کو جانتی تھیں جو کہ دیگر احادیث میں مذکور ہے۔

5. نیز عائشہ رضی اللہ عنہا کی والدہ ام رومان کا انہیں قبل از رخصتی صحت کے حوالے سے ان پر خصوصی توجہ دینا تاکہ وہ رخصتی کے قابل ہو جائیں اس کے لیے انہیں ککڑی اور کھجور کا استعمال کرایا جس سے وہ متناسب فربہ ہو گئیں۔ جس کی صراحت سنن ابن ماجہ میں کچھ اس طرح ہے:

عن عائشة قالت :" كانت أمي تعالجني للسمنة تريد أن تدخلني على رسول الله صلى الله عليه وسلم فما استقام لها ذلك حتى أكلت القثاء بالرطب فسمنت كأحسن سمنة ." [4]

"عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رخصتی سے قبل میری والدہ مجھے ککڑی اور کھجور کا استعمال کرواتی تھیں تا آنکہ میں کچھ فربہ اور توانا ہو گئی"۔

یہ تمام الفاظ کس چیز پر دلالت کرتے ہیں۔ فافهم فتدبر

کتبِ سیر میں کسی اہلِ علم نے اس مسئلہ میں اختلاف کیا ہو کہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی عمر نکاح کے

---

[1] صحيح البخاري: 4791، 4835، صحيح المسلم: 1480، 1481، سنن النسائی: 1577

[2] صحيح البخاري: 3826

[3] صحيح البخاري: 4412

[4] سنن ابن ماجه، باب القثاء والرطب: 3324 مكتبة دارالسلام

وقت جو احادیث میں بیان کی گئی ہیں وہ صحیح نہیں؟ کوئی ایک مستند حوالہ اس سلسلہ میں موجود ہے؟ کیا ان روایات سے یہ واضح نہیں ہوجاتا کہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی عمر نکاح کے وقت کم تھی۔ آخر میں ہم عائشہ رضی اللہ عنہا کے اس قول پر بحث کو ختم کرتے ہیں: وقد قالت عائشة إذا بلغت الجارية تسع سنين فهي امرأة[1] -

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ: "جب لڑکی 9 سال کی ہوجائے تو وہ عورت ہے یعنی بالغ ہوگئی"۔

حدیث کے حوالے سے ان کی کذب بیانی اور خیانت کو ذکر کرنے کے بعد اب رہا ان کا یہ کہنا کہ: "یہ حدیث قرآن کے خلاف ہے"۔ اس حوالے سے انہوں نے جو کچھ دلیل کے طور پر لکھاہے وہ انہی کے الفاظ میں کچھ اس طرح ہے:

" بھلا نبی کریم ﷺ قرآن کی خلاف ورزی کس طرح کرتے کہ جس کی سورۂ نساء کی آیت: 6 میں **(بلغوا النکاح)** کی اصطلاح موجود ہے اور اس کا معنی یہ ہیں کہ نکاح کے لیے بلوغت لازم ہے"۔

اب ہم سورۃ النساء کی آیت: 6 کو بمع ترجمہ ہدیۂ قارئین کرتے ہیں تاکہ یہ واضح ہوجائے کہ یہ لوگ احادیث رسول ﷺ پر آئے دن خامہ فرسائی کرتے ہیں اور زہر اگلتے ہیں، بکواسات کرتے ہیں اور کوئی موقع حدیث دشمنی کا ضائع نہیں کرتے ان کا اپنا مبلغ علم کیا ہے:

قَالَ تعَالَىٰ:﴿ وَٱبۡتَلُواْ ٱلۡيَتَٰمَىٰ حَتَّىٰٓ إِذَا بَلَغُواْ ٱلنِّكَاحَ فَإِنۡ ءَانَسۡتُم مِّنۡهُمۡ رُشۡدٗا فَٱدۡفَعُوٓاْ إِلَيۡهِمۡ أَمۡوَٰلَهُمۡۖ وَلَا تَأۡكُلُوهَآ إِسۡرَافٗا وَبِدَارًا أَن يَكۡبَرُواْۚ وَمَن كَانَ غَنِيّٗا فَلۡيَسۡتَعۡفِفۡۖ وَمَن كَانَ فَقِيرٗا فَلۡيَأۡكُلۡ بِٱلۡمَعۡرُوفِۚ فَإِذَا دَفَعۡتُمۡ إِلَيۡهِمۡ أَمۡوَٰلَهُمۡ فَأَشۡهِدُواْ عَلَيۡهِمۡۚ وَكَفَىٰ بِٱللَّهِ حَسِيبٗا ٦ ﴾ النساء: ٦

"اور یتیموں کو ان کے بالغ ہو جانے تک سدھارتے اور آزماتے رہو پھر اگر ان میں تم ہوشیاری اور حسن تدبیر پاؤ تو انہیں ان کے مال سونپ دو اور ان کے بڑے ہو جانے کے ڈر سے ان کے مالوں کو جلدی جلدی فضول خرچیوں میں تباہ نہ کر دو، مال داروں کو چاہئے کہ (ان کے مال سے) بچتے رہیں، ہاں مسکین محتاج ہو تو دستور کے مطابق واجبی طور سے کھالے، پھر جب انہیں ان کے مال سونپو تو گواہ بنالو، دراصل حساب لینے والا اللہ تعالیٰ ہی کافی ہے"۔

[1] سنن الترمذی: 1027

قرآن سے ان کو کیا نسبت ہے ؟ ایسی قرآن فہمی انہوں نے کیسے اور کہاں سے حاصل کی ؟ جو شخص (بَلَغُوا النِّكَاحَ) کو ایک اصطلاح کا نام دے کر قرآن مجید میں معنوی تحریف کر دے کہ نکاح کے لیے بلوغت لازم ہے۔ اتنا بڑا جھوٹ اور وہ بھی اللہ کی کتاب پر۔ افسوس ہے ایسے لوگوں پر جو ان جیسے لوگوں پر دینی معلومات میں اعتماد کرتے ہیں، یہ تو کسی طرح بھی صحیح دین کی ترجمانی کرنے والے نہیں ہیں بلکہ حقیقۃً دین کو بدنام کرنے والے ہیں۔

عائشہ رضی اللہ عنہا کا کم عمری / صغر سنی میں نکاح ہونا تو قرآن مجید کی سورۃ الطلاق کے عموم سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ صغر سنی میں نکاح ہو سکتا ہے اور اس کا شرعاً اعتبار بھی ہے نیز طلاق بھی دی جائے تو واقع ہو گی۔ نیز ایسی مطلقہ کی عدت کے مسائل پر بھی سورۃ الطلاق میں قدرے تفصیل سے بات کی گئی ہے جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

قَالَ تَعَالَیٰ:﴿ وَالَّٰٓـِٔي يَئِسْنَ مِنَ الْمَحِيضِ مِن نِّسَآئِكُمْ إِنِ ارْتَبْتُمْ فَعِدَّتُهُنَّ ثَلَٰثَةُ أَشْهُرٍ وَالَّٰٓـِٔي لَمْ يَحِضْنَ ۚ وَأُولَٰتُ الْأَحْمَالِ أَجَلُهُنَّ أَن يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ ۚ وَمَن يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَل لَّهُۥ مِنْ أَمْرِهِۦ يُسْرًا ﴿٤﴾ ﴾ الطلاق: ٤

" تمہاری عورتوں میں سے جو حیض سے ناامید ہو گئی ہوں، اگر تمہیں شبہ ہو تو ان کی عدت تین مہینے ہے اور ان کی بھی جنہیں حیض آنا شروع ہی نہ ہوا ہو اور حاملہ عورتوں کی عدت ان کا وضع حمل ہے اور جو شخص اللہ تعالیٰ سے ڈرے گا اللہ اس کے (ہر) کام میں آسانی کر دے گا"۔

اس آیت کے ترجمہ پر غور کرنے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ جب انہیں حیض آنا شروع نہیں ہوا ان کی عدت چاہے طلاق کی عدت ہو یا خاوند کے وفات پانے کی فَعِدَّتُهُنَّ ثَلَٰثَةُ أَشْهُرٍ یعنی ان کی عدت تین ماہ ہے۔

اس آیت کریمہ سے یہ مسئلہ روزِ روشن کی طرح واضح ہے کہ صغر سنی کا نکاح بھی معتبر ہے اور طلاق بھی۔ نیز ضمناً یہ بات بھی محتاج بیان نہیں رہتی کہ اس حوالے سے حدیث کو آیت قرآنی کے خلاف قرار دینے والوں کا مبلغ علم کیا ہے ؟ کہاں سے انہوں نے پڑھا ہے، کن سے پڑھا ہے ؟ انہیں قرآن سے کتنی نسبت ہے۔ راتوں رات" علامہ " بننے والوں کا یہی حال ہوتا ہے۔ جنہیں قرآن کا صحیح ترجمہ نہیں آتا وہ "مفکر اسلام" سے کم پر راضی نہیں ہوتے، معلوم نہیں انہیں قرآن ناظرہ دیکھ کر بھی پڑھنا آتا ہے یا نہیں۔

حدیث ❷:

دوسری حدیث جو کہ انہیں معیارِ روایت ودرایت کے خلاف نظر آئی وہ یہ ہے جسے بخاری ومسلم نے روایت کیا ہے: جس کے بارے میں وہ لکھتے ہیں کہ:"رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کو "متعہ" (زنا بذریعہ عارضی نکاح) کی اجازت دی تھی، (بخاری کتاب النکاح، باب ۳۱، صحیح مسلم: باب ۲۔ حدیث نمبر ۸۸۸)۔ یہ بدکاری بشکل متعہ سنت تواتر سے ثابت نہ ہونے کی وجہ سے سنت تواتر کے خلاف قرار پاتی ہے، یہ اپنی من پسند حدیث یقیناً اسلام کو بدنام کرنے کیلئے ان ہی یہودی منافقین نے گھڑ لی ہے جو خود متعہ جیسی بدکاری میں ملوث ہیں"۔

اس جگہ ہم سب سے پہلے مذکورہ مقام سے روایت مع ترجمۃ الباب اور اس کا ترجمہ پیش کرتے ہیں اس کے بعد اس پر مزید علمی بحث کریں گے۔ جہاں تک سنت تواتر کا موصوف راگ الاپ رہے ہیں اس کی وضاحت ہم کر چکے ہیں:

باب نهى رسو ل الله صلى الله عليه وسلم عن النكاح المتعة أخيرا

حدثنا مالك بن إسماعيل حدثنا ابن عيينة أنه سمع الزهري يقول أخبرني الحسن بن محمد بن علي وأخوه عبد الله بن محمد عن أبيهما أن عليا رضي الله عنه قال لابن عباس **إن النبي صلى الله عليه وسلم نهى عن المتعة وعن لحوم الحمر الأهلية زمن خيبر**

حدثنا محمد بن بشار حدثنا غندر حدثنا شعبة عن أبي جمرة قال سمعت ابن عباس سئل عن متعة النساء فرخص فقال له مولى له إنما ذلك في الحال الشديد وفي النساء قلة أو نحوه فقال ابن عباس نعم-

حدثنا علي حدثنا سفيان قال عمرو عن الحسن بن محمد عن جابر بن عبد الله وسلمة بن الأكوع قالاكنا في جيش فأتانا رسول رسول الله صلى الله عليه وسلم فقال **إنه قد أذن لكم أن تستمتعوا فاستمتعوا** وقال ابن أبي ذئب حدثني إياس بن سلمة بن الأكوع عن أبيه عن رسول الله صلى الله عليه وسلم **أيما رجل وامرأة توافقا فعشرة ما بينهما ثلاث ليال فإن أحبا أن يتزايدا أو يتتاركا تتاركا** فما أدري أشيء كان لنا خاصة أم للناس عامة قال أبو عبد الله وبينه علي عن النبي صلى الله عليه

وسلم أنه منسوخ[1].

”علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہے کہ نبی کریم ﷺ نے خیبر کے دن عورتوں سے نکاح متعہ کرنے اور پالتو گدھوں کا گوشت کھانے سے منع فرما دیا۔

ابو حمزہ کہتے ہیں کہ میں نے ابن عباس رضی اللہ عنہ سے نکاح متعہ کا مسئلہ پوچھا، تو انہوں نے اسے جائز بتایا، ان کے آزاد کئے ہوئے غلام نے کہا یہ تو جب تھا کہ سخت ضرورت ہوتی اور عورتیں کم ہوتیں، تو ابن عباس کہا، جی ہاں!“۔

حدیث اور اس کا ترجمہ آپ کے سامنے ہے اس جگہ بھی ہمارے سوالات وہی ہیں کہ:

☜ سب سے پہلے مضمون نگار اپنے دعویٰ کے مطابق ہمیں اس حدیث میں وہ راوی دکھائیں جو یہودی ہیں یا منافقین ہیں؟

☜ محدثین کی جماعت میں سے کس محدث نے ان راویوں پر جرح کی ہے، اسماء الرجال کی کتب سے ذرا ان رواۃ کی نشاندہی کریں۔

(قُلْ هَاتُوا۟ بُرْهَـٰنَكُمْ إِن كُنتُمْ صَـٰدِقِينَ ﴿١١١﴾ البقرۃ

”اگر تم سچے ہو تو دلیل سے بات کرو“۔

کیا ان دعووں کی حیثیت صرف جھوٹے دعووں کی نہیں ہے؟ کیا آپ کا دامن اس حوالے سے دلائل سے خالی نہیں ہے؟ ائمہ محدثین میں سے کوئی ایک محدث، ائمہ جرح وتعدیل میں سے کوئی ایک امام، ائمہ اصولیین میں سے کوئی ایک امام ایسا ہو جو آپ کا اس مسئلہ میں ساتھ دیتا نظر آتا ہو؟ یہ سارا تواتر تو آپ کے خلاف جارہا ہے۔ آپ کو متعہ کا ذکر اس روایت میں تو نظر آگیا لیکن اس حدیث کی ابتدا میں حرمتِ متعہ کا باب جو امام بخاری نے جلی الفاظ میں قائم کیا وہ نظر نہیں آیا۔

جبکہ صحیح اور انصاف پر مبنی حقیقت تو یہ ہے کہ آپ اپنے تئیں کتنا ہی دین دار باور کروائیں آپ دین سے دشمنی کرنے والوں کی صف میں کھڑے ہیں۔

اس جگہ بھی ترجمہ کرتے ہوئے موصوف نے وہی خیانت کی ہے کہ متعہ کی وضاحت بریکٹ میں (زنا

---

[1] صحيح البخارى: باب نهي رسول الله صلى الله عليه وسلم عن نكاح المتعة آخرا

بذریعہ عارضی نکاح) کیا ہے۔

جب آپ اسے خود بھی نکاح کہتے ہیں تو پھر اسے زنا کہنا کس دلیل کی بنا پر؟ شرعاً وہ ایک وقت تک بطور نکاح رائج تھا۔ مزید یہ کہ متعہ میں تو باقاعدہ نکاح ہوتا تھا۔ حق مہر بھی ہوتا تھا۔ کسی شوہر والی عورت سے نہیں ہوتا تھا۔ یہ تمام چیزیں موصوف مجہول تو خلاف سنت تواتر نظر آتی ہیں اب آپ اس سے آگے آنے والے حکم قرآنی کو پھر اس پر کیا حکم لگائیں گے۔

کیا آدم علیہ السلام کے وقت میں بھائی بہن کا آپس میں نکاح ہونا بیان نہیں کیا جاتا، پھر اس پر کیا حکم لگائیں گے؟ نیز قرآن مجید میں لونڈی کے بارے میں واضح طور پر ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

قَالَ تَعَالَىٰ: ﴿ وَٱلْمُحْصَنَٰتُ مِنَ ٱلنِّسَآءِ إِلَّا مَا مَلَكَتْ أَيْمَٰنُكُمْ ﴾ النساء: ٢٤

” اور (حرام کی گئیں) شوہر والی عورتیں مگر وہ جو تمہاری ملکیت میں آجائیں۔(لونڈیاں)“

اس آیت کے تحت ہم جامع ترمذی سے صرف اس کے شانِ نزول پر بغیر کسی تبصرہ کے اکتفاء کریں گے تاکہ بحث طویل نہ ہو جائے اور یہ ثبوت تو قرآن دے رہا ہے:

عن أبي سعيد الخدري قال: "أصبنا سبايا يوم أوطاس لهن أزواج من قومهن فذكروا ذلك لرسول الله صلى الله عليه وسلم فنزلت ﴿ وَٱلْمُحْصَنَٰتُ مِنَ ٱلنِّسَآءِ إِلَّا مَا مَلَكَتْ أَيْمَٰنُكُمْ ﴾ النساء: ٢٤

سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ:” ہم نے جنگ اوطاس کے موقع پر مال غنیمت میں کچھ ایسی عورتیں قید کیں جو شادی شدہ تھیں اور ان کے شوہر بھی اپنی اپنی قوم میں موجود تھے، جب نبی کریم ﷺ سے اس کا تذکرہ کیا گیا تو یہ آیت نازل ہوئی:

﴿ وَٱلْمُحْصَنَٰتُ مِنَ ٱلنِّسَآءِ إِلَّا مَا مَلَكَتْ أَيْمَٰنُكُمْ ﴾ النساء: ٢٤“۔

اب آپ اس جگہ کیا کہیں گے؟ آپ کا اور ہمارا کام بحیثیت مسلمان شرعی احکام پر ایمان لانا ہے نہ کہ مشورہ دینا کہ یوں ہونا چاہیئے تھا، یوں نہیں ہونا چاہیئے تھا، ایسا ہوگا تو مانوں گا وگرنہ نہیں مانوں گا۔

حدیث ❸:

جبکہ تیسری حدیث جنہیں موصوف عقل کے خلاف بتا رہے ہیں بخاری و مسلم کے حوالے سے اس طرح نقل کیا ہے۔

تیسری مثال یعنی خلافِ عقل و فطرت والی حدیث یہ ہے کہ: "جب کچھ حضرات کو مدینہ منورہ کی آب وہوا راس نہ آئی تو نبی کریم ﷺ نے حکم دیا کہ وہ حضرات اونٹ کے دودھ کے ساتھ اونٹ کا پیشاب بھی پیا کریں۔ یہ نسخہ استعمال کیا گیا اور سب لوگ صحت یاب ہو گئے"۔

یہ حدیث کئی کتب میں اس طرح مروی ہے:

حدثنا نصر بن علي الجهضمي حدثنا عبد الوهاب حدثنا حميد عن أنس أن ناسا من عرينة قدموا على رسول الله صلى الله عليه وسلم فاجتووا المدينة فقال ﷺ لو خرجتم إلى ذود لنا فشربتم من ألبانها وأبوالها ففعلوا .[1]

"انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ عرینہ قبیلے کے کچھ لوگ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ مدینہ کی آب وہوا راس نہ آئی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر تم ہمارے اونٹوں کے باڑے میں جاؤ اور ان کا دودھ اور پیشاب ملا کر پیو (تو شاید تم تندرست ہو جاؤ) چناچہ انہوں نے ایسا ہی کیا۔"

حدیث اور اس کا ترجمہ آپ کے سامنے ہے اس جگہ بھی ہمارے سوالات وہی ہیں کہ:

- ☜ سب سے پہلے مضمون نگار اپنے دعویٰ کے مطابق ہمیں اس حدیث میں وہ راوی دکھائیں جو یہودی ہیں یا منافقین ہیں؟
- ☜ محدثین کی جماعت میں سے کس محدث نے ان راویوں پر جرح کی ہے، اسماء الرجال کی کتب سے ذرا ان رواۃ کی نشاندہی کریں۔

(قُلْ هَاتُوا۟ بُرْهَـٰنَكُمْ إِن كُنتُمْ صَـٰدِقِينَ ﴿١١١﴾ البقرة

"اگر تم سچے ہو تو دلیل سے بات کرو"۔

کیا ان دعووں کی حیثیت صرف جھوٹے دعووں کی نہیں ہے؟ کیا آپ کا دامن اس حوالے سے دلائل سے خالی نہیں ہے؟، ائمہ محدثین میں سے کوئی ایک محدث، ائمہ جرح و تعدیل میں سے کوئی ایک امام، ائمہ اصولیین میں سے کوئی ایک امام ایسا ہو جو آپ کا اس مسئلہ میں ساتھ دیتا نظر آتا ہو؟ یہ سارا تواتر تو آپ کے خلاف جا رہا ہے۔ تو کیا نتیجتاً یہ کہنا آسان نہیں ہے آپ معاذ اللہ ان تمام محدثین کرام کو ہی بیک

[1] البخاري:226،2795،6304- المسلم:3163- النسائي:3959- ابوداؤد:3798- مسنداحمد:12639- سنن ابن ماجه، كتاب الطب، باب أبواب الإبل، 3503

جنبشِ قلم مخالفین دین وشریعت طبقہ میں گردانناچاہتے ہیں۔
بلکہ صحیح اور انصاف پر مبنی حقیقت آپ خود اپنے بارے میں کہہ دیں کہ آپ کس صف میں کھڑے ہیں؟؟؟

مندرجہ بالا حوالہ جات سے آپ کو علم ہو گیا ہو گا کہ حدیث کی کتب میں یہ مسئلہ اسی قدر ذکر ہوا ہے۔اس جگہ ہم یہی کہیں گے کہ شرعاً اگر ایک چیز کا حکم موجود ہے تو پھر اس کی تاویل چہ معنیٰ دارد؟ بلکہ اضطراری کیفیت میں تو خنزیر بھی، کہ جس پر قرآنی نص صریح ہے کہ وہ نجس العین ہے، استعمال کیا جاسکتاہے تو بطورِ دواء کے اونٹنی کے پیشاب میں بھی کوئی حرج نہیں آج بھی ہیپاٹا ئیٹس C.B یعنی یرقان کے مریض کو اونٹنی کا دودھ اور اس میں چند قطرے پیشاب کے ملا کر اس کو پلایا جائے تو شفاء ہو جاتی ہے، رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے اللہ تعالیٰ نے حرام چیز میں شفاء نہیں رکھی ہے۔

عن أم سلمة عن النبى صلى الله عليه وسلم قال : إِنَّ اللَّهَ لَمْ يَجْعَلْ شِفَاءَكُمْ فِيمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ. [1]
رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے حرام چیز میں شفاء نہیں رکھی ہے۔
بلکہ صحیح بخاری میں کتاب الطب کے آخر میں ہے: امام زھری رحمہ اللہ اپنے شاگرد کے سوال کے جواب میں فرماتے ہیں: " أَوْ أَبْوَالَ الْإِبِلِ قَالَ قَدْ كَانَ الْمُسْلِمُونَ يَتَدَاوَوْنَ بِهَا فَلَا يَرَوْنَ بِذَلِكَ بَأْسًا" ”جہاں تک اونٹنی کے پیشاب پینے کا تعلق ہے اس حوالے سے مسلمان برابر ان چیزوں سے دوا کرتے رہے ہیں اور انہوں نے اس میں کوئی مضائقہ نہیں دیکھا“۔

مذکورہ عبارت بار بار پڑھئے اور غور کیجئے امام زہری جو صغار تابعین میں سے ہیں ان کی صحابہ سے ملاقات ثابت ہے اس جگہ ''مسلمون'' سے وہ کسے مراد لے رہے ہیں ظاہر ہے کہ اس سے مراد صحابہ کرام کی مقدس جماعت اور تابعین حضرات ہی مراد ہوسکتے ہیں،ان کا تواتر عملی بھی آپ کی اصطلاح میں آپ ہی کے خلاف جارہاہے۔

اللهم أرنا الحق حقاً وارزقنا اتباعه وأرنا الباطل باطلاً وارزقنا اجتنابه



[1] : سنن الكبرىٰ للبيهقي:20117- صحيح ابن حبان:1391

دعوت دین کے مختلف ذرائع اور ان کے استعمال کی شرعی حیثیت

تالیف: فضیلۃ الشیخ عدنان محمد عرعور حفظہ اللہ **مترجم:** ڈاکٹر عبدالرحمٰن یوسف مدنی[1]

زیر نظر مضمون دراصل عالم عرب کے معروف و مشہور مؤلف اور داعی عدنان عرعور حفظہ اللہ کی کتاب " **منهج الدعوة في ضوء الواقع المعاصر** "دعوت کے وسائل وذرائع سے متعلق چند اہم مباحث کا اردو ترجمہ ہے۔مذکورہ کتاب امیر نائف کے سنت نبویہ اور عصر حاضر کے اسلامی علوم کے موضوع پر عالمی ایوارڈ یافتہ ہے۔عربی زبان میں یہ کتاب شائع ہوچکی ہے۔دعوت و تبلیغ کے اسلوب و منہج وسائل و ذرائع کے موضوع کے اعتبار سے بہت مفید اور نایاب کتاب ہے۔اس کتاب کو فضیلۃ الشیخ ڈاکٹر عبدالرحمٰن یوسف حفظہ اللہ نے اردو قالب میں ڈھالا ہے۔اردو ترجمہ کی کمپوزنگ مکمل ہوچکی ہے۔اور کتاب کا مکمل ترجمہ طباعتی مراحل میں ہے۔اور عنقریب مکمل کتاب شائع ہوکر قارئین کے ہاتھوں میں ہوگی۔طلباء علم اور دعوت و تبلیغ کے شہ سواروں کیلئے مشعل راہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ادارہ نے ڈاکٹر صاحب سے کتاب کے چند اہم مباحث کی اشاعت کی درخواست کی جسے انہوں نے بخوشی قبول فرمایا اللہ تعالیٰ ان کے علم و عمل میں برکت عطا فرمائے کی ان کی اجازتِ خاص سے اس کتاب کے تیسرے باب کے چند اہم مضامین کو" **البیان**" نے شائع کرنے کا اہتمام کیا ہے۔اللہ تعالیٰ مؤلف و مترجم کی کاوشوں کو قبول و منظور فرمائے اور اس عظیم کام کو ان کے لئے توشہ آخرت بنائے۔(ادارہ)

دعوت میں مختلف ذرائع ووسائل کے استعمال کی شرعی حیثیت

اس میں سات مضامین ہیں:

﴿1﴾: مقاصد، اُسلوب اور وسائل وذرائع کا باہمی ربط۔

اس میں دو عنوان ہیں:

❶ متذکّرہ بالا الفاظ کا مفہوم۔

اس زندگی میں انسان کے کچھ مقاصد ہیں۔ہر مقصد تک رسائی کا ایک طریقِ کار ہے، اور ہر طریق

[1] سابق پروفیسر اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور

کار کے کچھ اسباب و وسائل ہیں۔ مثلاً: سفر کو لے لیں اس کا مقصد مسافر کو معلوم ہوتا ہے کہ وہ تجارت کرنا چاہتا ہے یا سیر و تفریح یا کوئی اور مقصد ہے۔

سفر کرنے کے طریقے بھی جانے پہچانے ہیں۔ ان سے ہٹ کر کوئی طریقہ اختیار نہیں کیا جاسکتا۔ جب کہ وسیلہ اس چیز کو کہتے ہیں جس کے ذریعے مقصد تک پہنچنے کے لئے اس راہ پر چلتے ہوئے مدد حاصل کی جاتی ہے۔ یہ سفر کے لئے کوئی بھی ہو سکتا ہے مثلاً زمینی راستہ، سواری اور وہ کسی بھی طرح کی ہو سکتی ہے، زادِ راہ، اسلحہ، مال و دولت ممکن ہے اس وسیلہ میں گفتگو اور وعظ و نصیحت جیسی چیزیں بھی آجائیں۔

اگر ہم اسے دینی معاملات پر منطبق کرنا چاہیں تو اس طرح کہہ سکتے ہیں کہ دینِ اسلام کے کچھ مقاصد ہیں، کچھ راستے ہیں اور کچھ وسائل و ذرائع ہیں دینِ اسلام کے مقاصد اللہ کی رضا کا حصول، اس کی گرفت سے بچاؤ اور اس کے انعام کا حصول ہے یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے طے کردہ اور منصوص ہے۔ اس کا عقل اور اجتہاد سے کوئی تعلق نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اسے قرآن مجید میں اور رسول اللہ ﷺ نے حدیث میں بیان کر دیا ہے۔ فرمان ربّ العزت ہے:

﴿وَٱبۡتَغُوٓاْ إِلَيۡهِ ٱلۡوَسِيلَةَ ۝٣٥﴾ المائدۃ

"اور صرف اُسی کے تقرّب کے طالب بنو"۔

یہ آیت واضح طور سے بتارہی ہے کہ دین کا مقصد اللہ تعالیٰ سے تقویٰ اور اس کی رضا کا حصول ہے۔

ربّ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَٱللَّهُ يَدۡعُوٓاْ إِلَىٰ دَارِ ٱلسَّلَٰمِ ۝٢٥﴾ الیونس

"اور اللہ امن و سلامتی کے گھر کی طرف بلاتا ہے"۔

باری تعالیٰ نے صحابہ کرام کے بارہ میں ارشاد فرمایا: يَبۡتَغُونَ فَضۡلٗا مِّنَ ٱللَّهِ وَرِضۡوَٰنٗاۖ ۝٢٩﴾ الفتح

"تم انہیں اللہ کے فضل اور اس کی خوشنودی کی طلب میں سرگرم پاؤ گے"۔

رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے : " أَلَاإِنَّ سِلْعَةَ اللّٰهِ غَا لِيَةٌ أَلَاإِنَّ سِلْعَةَ اللّٰهِ الجَنَّةُ" " لوگو! اللہ تعالیٰ کا سودا بہت مہنگا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا سودا جنّت ہے"۔[1]

خریدار کا مقصد سودا حاصل کرنا ہوتا ہے۔

[1] الترمذي : 4650، المستدرک الحاکم : ج4 ص 308۔

دینِ اسلام کے راستے میں توحیدِ باری تعالیٰ، شریعت کے مطابق اس کی عبادت، اَمر و نہی میں اس کی اطاعت و فرماں برداری، اس کے رسولوں پر ایمان اور ان کی اتباع، نماز کا اہتمام، روزہ رکھنا اور بیت اللہ کا حج کرنا یہ سب مقصد تک پہنچے کے راستے ہیں۔

ان معنوں میں اللہ تعالیٰ تک پہنچانے والے راستے شریعت کی طرف سے طے کردہ ہیں۔ ان میں اجتہاد کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اپنی طرف سے کوئی طریقہ اختیار کرنا ناجائز ہے۔ ان راستوں میں سے ایک اہم راستہ دعوتِ دین ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿ قُلْ هَٰذِهِۦ سَبِيلِىٓ أَدْعُوٓا۟ إِلَى ٱللَّهِ ۚ عَلَىٰ بَصِيرَةٍ أَنَا۠ وَمَنِ ٱتَّبَعَنِى ۖ وَسُبْحَٰنَ ٱللَّهِ وَمَآ أَنَا۠ مِنَ ٱلْمُشْرِكِينَ ﴿١٠٨﴾ ﴾ یوسف

"کہہ دو: یہ میری راہ ہے میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں پوری بصیرت کے ساتھ۔ میں بھی اور وہ لوگ بھی جنھوں نے میری پیروی کی ہے اور اللہ پاک ہے اور میں مشرکوں میں سے نہیں ہوں"۔

اس آیت مبارکہ میں مقصد اور راستے کو ایک ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا قُرب مقصد ہے اور اس تک پہنچنے کا راستہ تبلیغِ دین ہے اور یہ دونوں توقیفی اور طے شدہ ہیں۔ ان میں انسان کی ذاتی رائے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اس آیت میں اسے "سبیل" کہہ کر بیان کیا گیا ہے جب کہ ایک دوسرے مقام پر اسے "صراط" کہا گیا ہے۔ جیسا کہ ارشاد ربّ العزت ہے:

﴿ وَأَنَّ هَٰذَا صِرَٰطِى مُسْتَقِيمًا فَٱتَّبِعُوهُ ۖ وَلَا تَتَّبِعُوا۟ ٱلسُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَن سَبِيلِهِۦ ۚ ذَٰلِكُمْ وَصَّىٰكُم بِهِۦ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ﴿١٥٣﴾ ﴾ الأنعام

"اور یہی میرا راستہ سیدھا ہے، اس کی پیروی کرو اور دوسری پگڈنڈیوں پر نہ چلو کہ وہ تمھیں اس کی راہ سے الگ کر دیں گی"۔

بلاشبہ راستہ اور شاہراہ شریعت کی طرف سے طے شدہ ہے۔ اگر ایسے نہ ہوتا تو اللہ تعالیٰ اتباع کا حکم نہ دیتے۔

باری تعالیٰ نے اس میں "فَاتَّبِعُوْهُ" کہہ کر امر کا صیغہ استعمال کیا ہے جس کا تقاضا یہ ہے کہ اسے اپنانا فرض ہے اور اس سے ہٹنا ناجائز ہے۔

اس کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ اللہ ربّ العزت نے دوسرے ایسے مختلف راستے اپنا کر

اس کی مخالفت کرنے سے بچنے کی تلقین کی ہے۔ جنہیں کوئی شخص یہ سمجھ لے کہ یہ بھی باری تعالیٰ تک پہنچاتے ہیں جب کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے یہ نہ بتائے ہوں۔ اس کو بدعت سازی کہتے ہیں جس کی حرمت شدید طریقے سے بیان کی گئی ہے۔

ارشادِ ربّ العزّت ہے: ﴿ أَمْ لَهُمْ شُرَكَٰٓؤُا۟ شَرَعُوا۟ لَهُم مِّنَ ٱلدِّينِ مَا لَمْ يَأْذَنۢ بِهِ ٱللَّهُ ﴿٢١﴾ ﴾

"کیاان کے کچھ شریک ہیں جنھوں نے ان کیلئے وہ دین بنایاہے جس کا اِذن اللہ نے نہیں دیا" الشوری

اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب کے بارے میں فرمایاہے:

﴿ وَرَهْبَانِيَّةً ٱبْتَدَعُوهَا مَا كَتَبْنَٰهَا عَلَيْهِمْ إِلَّا ٱبْتِغَآءَ رِضْوَٰنِ ٱللَّهِ ﴾ الحدید

" اور رہبانیت انہوں نے خود ایجاد کی۔ ہم نے ان کے اوپر صرف اللہ کی خوشنودی کی طلب فرض کی تھی"۔

آنحضرت ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: مَنْ أَحْدَثَ فِيْ أَمْرِنَا هٰذَا مَا لَيْسَ فِيْهِ فَهُوَ رَدٌّ

"جو شخص ہمارے دین میں کوئی نیا طریقہ اختیار کرتا ہے وہ مسترد ہے"۔[1]

ان دلائل کی روشنی میں بدعت کی تعریف یہ ہے " ہر وہ عمل جس سے اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنا اور رضا حاصل کرنا مقصود ہو اور اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ نے وہ عمل نہ بتایا ہو اسے اختیار کرنا بدعت ہے اور حرام ہے"۔

یہی وجہ ہے کہ اس آیت میں " سُبل " کی تفسیر "گمراہیاں" کی گئی ہے۔

امام مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے یہ کہہ کر اسے بالکل ہی واضح کر دیا کہ "سبل" سے مراد بدعات اور شبہات ہیں۔[2]

صحیح رائے یہ ہے کہ " سُبُل " کے لفظ کا اطلاق کسی بدعت یا طریقت کی حد تک محدود نہیں ہے بلکہ یہ تو اسلام اور سنّت کے علاوہ ہر راستے پر حاوی ہے۔ اس میں سیاسی مظاہرے، فوجی انقلابات، اجتماعی بم بلاسٹنگ وغیرہ تمام چیزیں آجاتی ہیں جبکہ ان کی تفصیل اپنے مقام پر آرہی ہے۔ اِنْ شاءاللہ

یہاں یہ حدیثِ نبوی ملحوظ رہے "جو شخص ہمارے اغیار کا طریقہ اختیار کرتا ہے اس کا ہم سے کوئی

---

[1] بخاري :2697، مسلم :1718 -

[2] سنن الدارمی :203 ،السّنة للمروزي :20 ، تفسيرابن أبي حاتم :ج5 ص1422

تعلّق نہیں"۔[1]

مدّعاو مقصود یہ ہے کہ اسلام کی طرف دعوت اور اسلامی حکومت کا قیام اسی طریقے سے ممکن ہے جو طریقہ شریعت نے بتلایاہے۔ اس کا ایک ہی طریقہ ہے کہ اس کی طرف دانائی اور عمدہ نصیحت کے ذریعے لوگوں کو بلایا جائے جو طریقہ اس سے ہٹ کر ہو وہ خود ساختہ اور سَراب ہے۔

دین کے وسائل وذرائع وہ ہیں جن کے ذریعے اللہ تعالیٰ کا دین پہنچانے، اسے سکھانے، اس کا بول بالا کرنے اور عبادتیں سرانجام دینے کے لئے مدد لی جاتی ہے وہ چیز جامد بھی ہوسکتی ہے جیسے نماز اور خطبے کے لئے لاؤڈ سپیکر اور تعلیم کے لئے قلم و قرطاس ہے۔ وہ وسیلہ متحرک بھی ہوسکتاہے جیسے حج کے لئے ٹرانسپورٹ کا استعمال ہے اور وہ ایک انداز اور اُسلوب بھی ہوسکتاہے جیسے درس دینا، لیکچر دینا اور کتاب لکھنا وغیرہ ہیں۔

❷ وسائل وذرائع کی شرعی حیثیت میں اہلِ علم کا اختلاف:

اہلِ علم اور داعی حضرات کے ہاں شریعت کے طے کردہ وسائل اور دعوتی وسائل کے سلسلہ میں کچھ اشکالات ہیں۔

اس اختلاف کی ایک وجہ یہ ہے کہ:

مختلف مسائل کی حیثیّت اجمالی طور پر متعیّن کی جاتی ہے۔ اس میں تفصیل اور مقصد کو منضبط نہیں کیا جاتا اور الفاظ کی تعریف نہیں کی جاتی اس لئے مختلف مسائل باہم متداخل ہوتے ہیں۔ ہر فریق مجمل اور باہم متداخل مسائل کو اپنے زاویہ نگاہ سے دیکھتاہے اور اپنی بیان کردہ تعریف کے سانچے میں رکھتاہے نتیجہ یہ ہوتاہے کہ اختلاف رائے پیدا ہو جاتاہے لہٰذا جس قدر مسائل کو تفصیل سے لیا جائے گا ان کی تعریف منضبط ہوگی، ان کے قواعد واُصول مقرر ہونگے اسی قدر مقصود واضح اور اختلاف رائے کم ہوگا۔

زیرِ نظر موضوع میں وجہ اختلاف یہ ہے کہ لفظ "ذرائع" کبھی تو محض عبادات کے لئے استعمال ہوتاہے جیسے نماز اور حج وغیرہ ہیں کہ انہیں اللہ کے قرب کے وسائل کہا جاتاہے اور کبھی یہ لفظ گذشتہ اِصطلاحی تعریف کے مطابق ایسی مادی چیزوں کے لئے استعمال ہوتاہے جو ان راستوں پر چلنے کیلئے معاون

---

[1] طبراني :ج 11 حديث: 11335 مسند الديلمي: حديث: 5309

بنتی ہیں جو لوگ اسے عبادت کے طریقِ کار مثلاً نماز کے لئے استعمال کرتے ہیں وہ اسے توقیفی قرار دیتے ہیں اور جو لوگ ذرائع کے لفظ کو مادی چیزوں کے لئے استعمال کرتے ہیں وہ اسے اجتہادی قرار دیتے ہیں۔

گذشتہ تمہید کی روشنی میں صحیح رائے یہ ہے کہ اگر ''ذرائع'' سے عبادت کے شرعی طریقے مراد لئے جائیں تو یہ توقیفی ہیں اور اگر اس سے مادی اور اُسلوب سے متعلّقہ چیزیں لیا جائے تو یہ توقیفی نہیں ہیں۔

دعوت و تبلیغ کے طریقوں کی بھی یہی صورت حال ہے طُرُق ووسائل کی اس تقسیم اور تعریف کے ذریعے علماء کے ہاں پائے جانے والے اختلاف رائے کی وجہ سے پیدا ہونے والا شبہ بھی ختم ہو گیا کیونکہ کچھ علماء طُرُق ووسائل کو توقیفی قرار دیتے ہیں اور کچھ اجتہادی اس کی تفصیل اور دلائل آئندہ عنوان میں ملاحظہ ہوں۔

﴿2﴾ دعوتی وسائل وذرائع کی تعریف اور اقسام:

منزل، راستے اور ذرائع کا فرق بیان کرنے کے بعد اب ہم ذرائع کی تعریف اور اس کے تفصیلی احکامات پوری شرح وبسط کے ساتھ پیش کرتے ہیں کیونکہ یہ اس فصل کا بنیادی موضوع ہے۔

اس میں پانچ عنوانات ہیں:

❶ ذریعہ اِبلاغ اور اس کی اقسام:

لفظ ''وسیلہ'' کا لغوی معنی قریب ہونا اور جوڑنا ہے، مثلاً: ہم کہتے ہیں زید نے بکر کے لئے وسیلہ اختیار کیا یعنی اس تک پہنچنے کا ذریعہ اپنایا۔

گویا کہ ''وسیلہ'' اس ذریعے کو کہتے ہیں جو منزل تک پہنچائے یا اس تک پہنچانے میں معاون ہو۔

دعوتِ دین کی اِصطلاح میں وسیلہ سے مراد وہ ذریعہ، سبب اور طریقہ ہے جس سے دعوت پہنچانے میں مدد لی جاتی ہے اور اس کی دو قسمیں ہیں۔

1. لوہا یا کاغذ وغیرہ سے بنے ہوئے مختلف مادی ذرائع جیسے لاؤڈ سپیکر، منبر اور کیسٹ وغیرہ۔
2. عملی ذرائع: اس سے مراد درس، باہمی گفت وشنید، مناظرہ، تعلیمی ورکشاپ وغیرہ ایسے مخصوص طریقے جنہیں کسی موضوع کی وضاحت کرنے، معلومات فراہم کرنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے ۔ اس مفہوم کے لحاظ سے یہ اور اُسلوب ہم معنی ہیں۔ تاہم اسے یہاں الگ سے بیان کیا جا رہا ہے

تاکہ اس کا معنی و مفہوم اور اسے استعمال کرنے کا دعوتی انداز واضح ہو جائے۔
وسیلے اور ذریعے کا مقصد کے ساتھ عموماً کوئی گہرا تعلّق نہیں ہوتا، نہ تو پیش کردہ دعوتی مضمون کے ساتھ اور نہ ہی طریقہ عبادت کے ساتھ اور نہ دعوت کے سیاق وسباق کے ساتھ۔
اس کا تعلّق بات کو پیش کرنے کے انداز کے ساتھ ہوتا ہے تاکہ اسے نکھار کر ذہن نشین کرکے، آسان طریقے سے اور دعوت کو وسیع تر دائرے میں پیش کیا جائے۔

❷ وسائل وذرائع کی شرعی حیثیت اور ان کے اُصول وضوابط:

وسائل وذرائع کے بارہ میں لوگوں کی مختلف آراء ہیں۔ کچھ افراط کا شکار ہیں تو کچھ تفریط کا اور کچھ متوسط بھی ہیں۔ ایک طرف وہ لوگ ہیں جنہوں نے شریعت کے اس اُصول کا سہارا لیا ہے کہ "ہر چیز کا استعمال بنیادی طور پر جائز ہے" وہ اسے بنیاد بنا کر ہر ذریعہ ابلاغ کو مطلق العنان ہو کر استعمال کرتے ہیں اس دوران وہ شرعی اُصول یا دینی نقصانات کسی بھی چیز کو خاطر میں نہیں لاتے۔
بلاضرورت تصویر بلکہ موسیقی جیسے حرام اور ناجائز ذرائع بھی استعمال کرتے ہیں۔
دوسری طرف تنگ نظر لوگ ہیں جنہوں نے ایک دوسرے اُصول کا سہارا لیا ہے اور وہ یہ ہے کہ تمام کام بنیادی طور پر منع اور شریعت کے جائز قرار دینے پر موقوف ہیں۔
وہ یہ کہتے ہیں کہ شریعت کی دوٹوک وضاحت کے بغیر کوئی بھی ذریعہ اختیار کرنا ناجائز ہے۔ ہمارے خیال کے مطابق یہ دونوں فریق صحیح اور درست رائے سے ہٹ چکے ہیں۔ جنہوں نے ہر ذریعے کو مطلقاً جائز قرار دیا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے ناجائز کردہ طریقے کو جائز قرار دینے کے مرتکب ہوئے ہیں جبکہ مطلقاً منع کرنے والوں نے لوگوں کے لئے باعث افادیّت چیزوں کو بے کار بنا کر رکھ دیا ہے اور میدانِ دعوت کو خراب کیا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ ناجائز ذریعے سے دین کی دعوت کیسے درست ہو سکتی ہے وگرنہ ہم بھی مکیفلی (اطالوی فلسفہ دان مکیفلی کے پیروکار) بن جائیں گے اور ربّ العالمین کی شریعت کے پیروکار نہیں رہیں گے۔ اسی طرح جس چیز کو شریعت نے جائز کہا ہے اسے ذریعہ ابلاغ بنانے کے لئے شریعت کی طرف سے وضاحت کی کیا ضرورت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ منع کرنے والے دعوتی طریقے میں پہلے خود ہی اس کی مخالفت کرتے ہیں۔
صحیح اور معتدل رائے یہ ہے کہ مادی اور معنوی دونوں طرح کے وسائل اختیار کرنا بنیادی طور پر

جائز ہیں۔ تاہم جس کے منع ہونے کی دلیل آگئی ہے وہ اس میں شامل نہیں ہیں وہ اجتہادی ہیں اور انہیں استعمال کرنا فوائد ونقصانات کے قواعد کے تابع ہے مثلاً: مسجد ہی کو لے لیں یہ گارے سے بھی تعمیر ہو سکتی ہے، پتھر سے بھی، لوہے سے بھی اور سیمنٹ سے بھی جیسے لوگوں کے حالات ہوں اور جیسے جگہ اور وقت کا تقاضا ہو اس کے مطابق اسے بنایا جاسکتا ہے جبکہ اس کی بے جا تزئین وآرائش بھی ایک طریقہ اور انداز ہے لیکن وہ اپنانا ناجائز ہے کیونکہ اس سے شریعت نے منع کیا ہے۔

❸ ذرائع ووسائل کے بنیادی طور پر جائز ہونے کے دلائل:

کتاب وسنّت میں اس کے واضح دلائل موجود ہیں، مثلاً:

❶ جہادی وسائل کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَأَعِدُّوا لَهُم مَّا اسْتَطَعْتُم مِّن قُوَّةٍ وَمِن رِّبَاطِ الْخَيْلِ ﴿٦٠﴾﴾ الأنفال

"اور ان کے لئے جس حد تک کر سکو فوج اور بندھے ہوئے گھوڑے تیار رکھو"۔

جنگ کی تیاری مختلف طریقوں سے ہو سکتی ہے یہاں اس کا غیر مشروط اور مطلق حکم ہے اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ جب تک کسی چیز کو مستثنیٰ کرنے یا حرام قرار دینے کی کوئی دلیل نہیں ہو گی اسے استعمال میں لانا جائز ہے۔ اگر یہ وسائل اجتہادی مسئلہ نہ ہوں تو شرعی دلیل کے بغیر کوئی بھی اسلحہ بنانا جائز نہ ہو۔ یہ آیت ہی اس کے جواز کی دلیل ہے۔

❷ آنحضرت ﷺ کا فرمان ہے "گھوڑے تین طرح کے ہوتے ہیں ایک باعث ثواب، ایک نہ باعثِ ثواب نہ باعثِ گناہ اور ایک باعثِ گناہ۔"[1]

گذشتہ تعریف کی روشنی میں "گھوڑا" نہ طریقہ ہے نہ مقصد ہے بلکہ یہ ایک ذریعہ اور وسیلہ ہے۔

احادیث میں اسے مالک کی نیّت اور اس کے مقصد پر چھوڑ دیا گیا ہے اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اس میں بھی "ہر چیز بنیادی طور پر جائز ہونے" کے اُصول کو سامنے رکھا گیا ہے۔ فقہاء نے بھی یہ اُصول بنایا ہے کہ ذرائع ووسائل کی شرعاً وہی حیثیّت ہے جو ان کے مقاصد کی حیثیّت ہے۔ اس کی تفصیل آگے بھی آرہی ہے۔

---

[1] بخاري :3642 ، مسلم: 987

❹ ذرائع استعمال کرنے کے شرعی اُصول:

ذریعہ ابلاغ کو بنیادی طور پر جائز قرار دینے کے کچھ اُصول اور ضابطے ہیں۔ اگر ان سے تجاوز کیا جائے گا تو وہ ناجائز قرار پائیں گے۔

❶ بنیادی طور پر کسی بھی ذریعے کو اختیار کرنا جائز ہے منع نہیں ہے۔ تاہم اگر شریعت کسی ذریعے کو اختیار کرنے سے منع کر دے، اسے اختیار کرنے سے کوئی معاشرتی خرابی پیدا ہوتی ہو تو وہ ناجائز ہو گا۔ اس کی دلیل پہلے بیان ہو چکی ہے۔

❷ جب کسی ذریعے کو اپنانے کی شریعت نے ترغیب دلائی ہو یا اسے نہ اپنانے سے بڑا فائدہ ختم یا کوئی بڑا نقصان ہو رہا ہو تو ایسی صورت میں اسے اپنانا ضروری ہو جاتا ہے۔ لہذا اس سے پیچھے نہیں ہٹنا چاہیے۔

جنگ کے لئے طاقت کے حصول اور مسجد میں بجلی کا استعمال دو کام ہمارے سامنے ہیں پہلے کے متعلّق صراحت موجود ہے جبکہ دوسرے کی صورتِ حال یہ ہے کہ اسے اختیار کرنے کے کئی فائدے ہیں اور کسی قسم کا کوئی نقصان نہیں ہے۔

❸ تیسرا اُصول یہ ہے کہ ذریعے اور وسیلے کو اس کے دائرے سے آگے نہ بڑھایا جائے کہ وہ بالذّات مقصد ہی بن جائے کیونکہ اس کا مقصد نیکی کے لئے نیکی سے تعاون کرنا ہے مثال کے طور پر مسجد کے مینار کو لے لیں۔ اس کا مقصد دائرہ اذان کو وسعت دینا ہے اور یہ مسجد کی نشان دہی کا ذریعہ بھی بن سکتا ہے اس لئے اسے بڑے سائز میں تعمیر کرنا جائز نہیں ہے اور نہ ہی ایسے انداز میں اس کی بے جا تزئین و آرائش کرنا درست ہے جس سے یہ اذان کو دور تک پہنچانے کا ذریعہ ہونے یا مسجد کی علامت ہونے سے نکل جائے اور مقصود بالذّات بن جائے۔ لوگ اس کی بناء پر فخر کا اظہار کرنے لگیں اور صورت حال یہ ہو جائے کہ بڑے مینار اور اونچے منبر کے بغیر یا بے آرائش منبر و مینار والی مسجد کو مسجد ہی نہ سمجھا جائے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ اندیشہ ہوتا ہے کہ لوگ وقت گزرنے کے ساتھ ذریعے کو اس کی حد سے بڑھا کر عبادت کا طریقہ بنا لیں گے اور وہ بدعت بن جائے گی جبکہ بدعات کا اسلام میں حرام ہونا واضح ہے۔ یا پھر بدعت نہیں تو اِسراف، محنت کا ضیاع اور دولت کا

بے جا مصرف بن جائے گا۔

4 چوتھا اُصول یہ ہے کہ وہ ذریعہ دعوتی مضمون یا مذہبی معاملے کو متأثر نہ کرے۔

اس کی مثال یہ لے لیں کہ منظر کشی کے لئے جن حضرات کا کردار ادا کیا جارہا ہے ان کے الفاظ تبدیل کر دیئے جائیں یا منبر کی طوالت اور خوبصورتی کی خاطر مسجد کی صفیں کٹ جائیں، ایسا کرنے سے شریعت کی واضح مخالفت ہوگی۔

5 خرابیوں کے انسداد کے لئے جس ذریعے کو ناجائز قرار دیا گیا ہو اسے استعمال کرنا صرف اس وقت جائز ہوگا جب اس سے کوئی مصلحت حاصل ہو اور اسے بقدر ضرورت استعمال کیا جائے نیز اس کی وجہ سے کوئی خرابی پیدا نہ ہو۔

کچھ ذرائع ایسے ہیں جنہیں قرآن وسنّت نے صراحتاً ناجائز کہا ہے، مثلاً سائرنگ بجانا، تصویر کشی کرنا، موسیقاری کرنا اور غیر محرم عورتوں کو دیکھنا۔ تاہم یہ بات طے شدہ ہے کہ کچھ چیزیں بالذّات خراب ہونے کی بناء پر ناجائز ہیں۔ جیسے زنا اور شراب ہے اور کچھ چیزیں دوسری خرابی کا ذریعہ بننے کی وجہ سے ناجائز ہیں مثلاً تصویر کشی کو شرک کا ذریعہ بننے، تخلیق باری تعالیٰ سے مماثلت کی بناء پر ناجائز کہا گیا ہے اسی طرح فحاشی سے بچنے کے لئے عورتوں کی طرف دیکھنا حرام کیا گیا ہے۔

جو چیز کسی خرابی کے انسداد کی بناء پر ناجائز ہو وہ کسی بڑے فائدے کے حصول کے وقت جائز ہو جائے گی بشرطیکہ اسے اختیار کرنے سے وہ خرابی پیدا نہ ہوتی ہو جس کی وجہ سے اسے حرام کیا گیا ہے مثلاً نامحرم عورتوں کو دیکھنا برائی کے دروازے کو بند کرنے کے لئے حرام ہے اس کے باوجود شریعت نے منگیتر کو دیکھنا جائز قرار دیا ہے کیونکہ یہاں ایک بڑا فائدہ ہو رہا ہے اور برائی والی خرابی پیدا ہونے کا اندیشہ نہیں ہے۔

امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ”اگر کسی کام سے خرابی کا باعث ہونے کی بناء پر منع کیا گیا ہو تو اسے بڑے فائدہ کے حصول کے لئے کرنا جائز ہوتا ہے“۔[1]

6 چھٹا اُصول یہ ہے کہ ”وہ ذریعہ بنیادی طور پر کافروں کی مذہبی علامت نہ ہو مثلاً: مساجد کو عیسائیوں

---

[1] مجموع الفتاوى: ج:1 ص: 124

کے گرجوں کی طرح تعمیر کرنا جائز نہیں ہے جیسا کہ کچھ علاقوں کی صورتِ حال ہے۔ اس کی دوسری مثال یہ ہے کہ شرعی کام کے آغاز سے آگاہ کرنے کے لئے سائرنگ یا گھنٹی بجائی جائے جیسا کہ نماز کے لئے اذان مقرر ہے۔

اس کی دلیل آنحضرت ﷺ کا یہ فرمان ہے: ''مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ''

''جو شخص کسی قوم سے مماثلت اختیار کرتا ہے وہ انہی میں شمار ہوتا ہے''۔ [1]

نیز یہ بھی فرمان ہے: ''جو شخص ہمارے اغیار کا طریقہ اپنائے وہ ہم میں سے نہیں ہے''۔ [2]

5 ذرائع اور مقاصد دونوں کی شرعی حیثیت یکساں ہے:

اگر ذریعہ بذات خود حرام نہ ہو تو اس کی شرعی حیثیت وہی ہے جو اس سے لئے جانے والے کام کی ہے اور وہ کام شرعاً جائز ہو تو ذریعے کا استعمال بھی ممنوع نہیں ہو گا۔

مثلاً: اذان کے لئے لاؤڈ سپیکر کے استعمال کو لے لیں اس کا مقصد لوگوں تک اذان کو پہنچانا ہے اور یہ کام شریعت کا طے کردہ ہے جب کہ لاؤڈ سپیکر کے استعمال سے مخالفت ثابت نہیں ہے لہذا اسے بطور ذریعہ استعمال کرنا نہ صرف جائز ہے بلکہ یہ باعثِ ثواب بھی ہے۔ اگر مقصد ہی ناجائز ہو تو اس کے لئے کوئی بھی ذریعہ اختیار کرنا جائز نہیں ہے یہ بات ہر صاحبِ عقل کے ہاں تسلیم شدہ ہے۔ لہذا ناحق خون بہانے یا شراب تیار کرنے کے لئے کوئی ذریعہ اختیار نہیں کیا جائے گا اگر کوئی شخص ذریعہ اختیار کرے گا تو اسے گناہ ہو گا کیونکہ یہ مقصد شرعاً ناجائز ہے۔

مختصر یہ ہے کہ ذریعے کا استعمال ایسی صورت میں بھی ناجائز ہے جبکہ وہ بذاتِ خود ناجائز ہو اور ایسی صورت میں بھی ناجائز ہے جب وہ بذاتِ خود تو جائز ہو لیکن اس سے لیا جانے والا کام ناجائز ہو۔ بالفاظ دیگر ذریعہ استعمال کرنے کی دو شرطیں ہیں۔

1. پہلی شرط یہ ہے کہ وہ بنیادی طور پر جائز ہو، قرآن وحدیث میں اس کے ناجائز ہونے کی صراحت نہ ہو۔
2. دوسری شرط یہ ہے کہ اس سے لیا جانے والا کام جائز ہو۔

---

[1] أبو داود: 4031

[2] طبراني: ج:11 حديث: 11335 / مسند الديلمي: حديث: 5309/صحيح الجامع: 5439۔

﴿3﴾ اسلام میں ذرائع ووسائل استعمال کرنے کی ترغیب:

وسائل کو اپنانا جائز ہے۔ اسلام نے اسے استعمال میں لانے کی ترغیب دلائی ہے بلکہ بعض مواقع پر اسے استعمال کرنے کا حکم دیا ہے اور ایسا کرنے والے کے لئے ثواب مقرر کیا ہے ضروری اور مصلحت پر مبنی ذرائع اختیار کرنے میں سستی کرنے سے بچنے کو کہا ہے۔ اس کی دلیل یہی کافی ہے کہ انبیاء پر کتابیں نازل ہوئیں اور لوگوں کو حکم دیا گیا کہ وہ انہیں محفوظ کریں اور انہیں عوام تک پہنچائیں۔ یہ بات کسی دلیل کی محتاج نہیں ہے۔

مثلاً نزول وحی کی ابتدائی آیات میں دعوتِ دین کے عظیم ذریعہ ''قلم'' کو ذکر کیا گیا ہے۔

فرمانِ باری تعالیٰ ہے: ﴿ اقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ ﴿٣﴾ الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ﴿٤﴾ ﴾ العلق

اللہ تعالیٰ نے روشنائی، قلم اور لکھنے کی قسم اٹھاتے ہوئے فرمایا: ﴿ نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُونَ ﴿١﴾ ﴾ القلم

یہ سب دعوت کے عظیم وسائل ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے تورات کو اپنے ہاتھ سے لکھا ہے۔ [1]

اللہ ربّ العزّت نے ممکنہ وسائل کو جہاد فی سبیل اللہ میں اختیار کرنے کا حکم دیتے ہوئے فرمایا

﴿ وَأَعِدُّوا لَهُم مَّا اسْتَطَعْتُم مِّن قُوَّةٍ وَمِن رِّبَاطِ الْخَيْلِ ﴿٦٠﴾ ﴾ الأنفال

''اور ان کے لئے جس حد تک کر سکو فوج اور بندھے ہوئے گھوڑے تیار رکھو''۔

اس سے مراد یہ ہے کہ اسلحہ سازی میں حالات کے مطابق ترقی کی جائے کیونکہ یہ حکم عام ہے مشروط نہیں ہے۔ اسے استطاعت اور طاقت کے ساتھ مربوط کیا گیا ہے۔ مسلمانوں میں ارتقاء کی جتنی صلاحیت ہے اس کے مطابق اسلحہ سازی ان پر فرض ہے۔

باری تعالیٰ نے یہ بھی فرمایا: ﴿ وَأَذِّن فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَأْتُوكَ رِجَالًا وَعَلَىٰ كُلِّ ضَامِرٍ يَأْتِينَ مِن كُلِّ فَجٍّ عَمِيقٍ ﴿٢٧﴾ ﴾ الحج

''ضامر'' سے مراد سفر کے لئے تیار کی گئی سواری ہے، یہ حکم ذرائع کو تیار کرنے اور اس کا اہتمام کرنے کا واضح اشارہ ہے بلکہ اس کا ثواب مقرر کیا گیا ہے جیسا کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی گذشتہ حدیث میں بیان ہو چکا ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: ''گھوڑے تین قسم کے ہوتے ہیں ایک باعثِ اجر،

[1] بخاري: 6614/مسلم:2652،356

ایک برابر برابر اور ایک بوجھ اور گناہ، باعث ثواب گھوڑے وہ ہیں جنہیں کوئی شخص راہِ جہاد کے لئے پالتاہے انہیں مسلمانوں کی چراہگاہ اور باغ میں رکھتاہے یہ گھوڑے جو چیز بھی اس چراگاہ یااس باغ میں کھاتے ہیں ان کے مأکولات کی تعداد کے برابر اس کے لئے نیکیاں لکھ دی جاتی ہیں بلکہ ان کی لید اور پیشاب کے برابر بھی اس کی نیکیاں لکھی جاتی ہیں جب وہ رَسّی توڑ کر بھاگتے یا کسی ٹیلے یا ٹیلوں پر چڑھتے ہیں تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے ان کے قدموں کے نشانات اور ان کی لِید کے برابر نیکیاں لکھ دیتاہے۔جب مالک اسے کسی نہر سے گزارے اور وہ اس میں سے پانی پیئیں خواہ وہ انہیں پانی پلانے کا ارادہ نہ بھی رکھتاہو اللہ تعالیٰ اس کے لئے اس کے پینے کے برابر نیکیاں لکھ دیتاہے۔[1]

آنحضرت ﷺ نے یہ بھی فرمایاہے:''اَلْخَيْلُ مَعْقُوْدٌ بِنَوَا صِيْهَا الْخَيْرُ اِلي يَوْمِ الْقِيَامَةِ''۔

''گھوڑوں کی پیشانیوں پر قیامت تک کے لئے نیکی باندھ دی گئی ہے''۔[2]

آنحضرت ﷺ نے فرمایا:''قَيِّدُوا الْعِلْمَ بِالْكِتَابِ''۔

''علم کو لکھ کر قابو کرو''۔[3]

آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جو شخص تیر اندازی سیکھنے کے بعد اسے چھوڑ دے اس کاہم سے کوئی تعلّق نہیں''،یا فرمایا: ''اس نے نافرمانی کی''[4]۔

وسائل کو اختیار کرنے سے متعلّق نبی کریم ﷺ کے اور بھی بہت سے فرامین ہیں۔

﴿4﴾ : انبیاء کرام اور ذرائع ووسائل کا استعمال:

انبیائے کرام علیہم السلام نے نہ صرف ذرائع ووسائل کو استعمال کرنے کی ترغیب دلائی بلکہ بذاتِ خود ان سب کو مختلف انداز میں میدانِ دعوت اور مختلف عبادتوں میں استعمال بھی کیا۔ظاہری معجزوں میں سے مثلاً موسیٰ علیہ السلام کا عصا، صالح علیہ السلام کی اونٹنی، سلیمان علیہ السلام کا محل اور بلقیس کے تخت کو لانا وغیرہ ہمارے سامنے ہے۔نوح علیہ السلام نے کشتی کو استعمال کیا، ابراہیم علیہ السلام نے ختنے کا دینی شعار اپنانے کے لئے اُسترا

---

[1] بخاري :2371 ، مسلم:987

[2] بخاري :2850، مسلم: 1873

[3] معجم الكبير للطبراني :700 قال الهيثمي فی مجمع الزوائد :ج1 ص152، رجاله رجال الصحيح

[4] مسلم :1919

استعمال کیا۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اَسّی سال کی عمر میں اُسترے کے ذریعے ختنہ کیا"۔[1]

اس سلسلہ میں ہمارے پیغمبر حضرت محمد ﷺ کی اَحادیث اور واقعات کا سلسلہ تو بہت طویل اور خوبصورت ہے مثلاً: آپ ﷺ نے ایک وضاحتی ذریعہ کے طور پر ریت کے ٹیلے پر خاکہ تیار کیا۔

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے ہمارے سامنے ایک لکیر کھینچی پھر اس کے دائیں اور بائیں کئی لکیریں کھینچیں۔[2]

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ہی کا بیان ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ایک مربع شکل بنائی پھر اس کے درمیان ایک لکیر اس سے باہر کھینچی پھر اس درمیان والی لکیر کی طرف (دونوں طرف سے) چھوٹی چھوٹی لکیریں کھینچی اور فرمایا: "یہ درمیان والا نکتہ انسان ہے۔ اور یہ مربع شکل کی لکیر اس کی موت ہے جو اسے گھیرے میں لئے ہوئے ہے اور یہ باہر جانے والی اس کی امید ہے اور یہ چھوٹی چھوٹی لکیریں اس کی زندگی میں پیش آمدہ مسائل ہیں اگر یہ (مسائل) اسے نہ پکڑیں تو یہ (اُمید) اسے دبوچ لیتی ہے اور اگر وہ اس سے بچ جائے تو یہ (موت) اسے پکڑ لیتی ہے"۔[3]

رسول اللہ ﷺ نے اپنے ایک دعوتی پیغام میں بکری کے مرے ہوئے بچے کو وضاحتی ذریعہ تبلیغ کے طور پر استعمال کیا۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کسی محلے سے آتے ہوئے بازار میں سے گزرے کچھ لوگ آپ ﷺ کے اِرد گرد جمع تھے۔ آپ ﷺ کا گزر چھوٹے کانوں والی مری ہوئی بکری کے پاس سے ہوا، آپ ﷺ نے اسے کان سے پکڑا اور فرمایا: "تم میں سے کون اسے ایک درہم میں خریدنا چاہے گا؟" وہ سب کہنے لگے: ہم تو اسے کسی بھی چیز کے عوض لینا پسند نہیں کرتے ہم اسے کیا کریں گے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: "کیا تم پسند کرو گے کہ یہ تمہاری ملکیت میں رہے؟" انہوں نے کہا

---

[1] بخاري: 3356، 6298/مسلم: 2370

[2] احمد: ج1ص 435/النسائي: 11174 /مستدرک الحاکم: ج2 ص318، 239

[3] بخاري: 6417، احمد: ج1ص 385

:اگر یہ زندہ ہوتی تب بھی ہم اسے عیب ناک سمجھتے کیونکہ یہ بہت چھوٹے کانوں والی ہے۔ مرنے کے بعد اسے کون لے گا۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:" اللہ کی قسم! یہ بکری جتنی تمہیں حقیر لگتی ہے۔ اللہ کے نزدیک دنیا اس سے بھی حقیر تر ہے"۔ پھر آپ ﷺ نے اسے پھینک دیا۔[1]

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم روزے کے دوران اپنے بچوں کو کھانے پینے کی چیزوں سے ہٹانے کے لئے اُون کے بنے ہوئے کھلونوں میں مصروف کر دیا کرتے تھے۔ ربیع بنت معوذ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ نبی مکرم ﷺ نے دس محرم کی صبح انصار کی بستیوں میں یہ اعلان کروایا کہ جس نے صبح روزہ نہیں رکھا وہ باقی دن کے لئے روزے کی نیّت کر لے اور جس نے رکھا ہے وہ اسے پورا کر لے۔ اس کے بعد ہم خود بھی روزہ رکھتیں اور اپنے بچوں کو بھی رکھواتیں، ہم ان کے لئے اون کا کھلونا تیار کر لیتیں۔ جب کوئی بچہ کھانے کی طلب کے لئے روتا تو ہم اسے وہ کھلونا دے دیتیں اتنے میں افطار کا وقت ہو جاتا۔[2]

دورانِ حج رسول اللہ ﷺ نے ربیعہ بن اُمیہ بن خلف رضی اللہ عنہ کی آواز کے ذریعے لوگوں تک بات پہنچائی۔ اگر کوئی اور واضح ذریعہ بات کو ذہن نشین کرنے کے لئے میسّر نہ آیا تو آپ ﷺ نے سامنے پڑی کنکریوں ہی سے کام لے لیا۔[3]

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ میں ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ کے پاس ان کی کسی زوجہ مطہّرہ کے گھر میں گیا، میں نے پوچھا: یارسول اللہ ﷺ! دو مسجدوں میں سے کس کی بنیاد تقویٰ پر رکھی گئی ہے؟ آپ ﷺ نے ہتھیلی میں کنکریاں لے کر انہیں زمین پر مارا اور مسجد نبوی کے بارہ میں فرمایا: " وہ یہ مسجد ہے" یعنی مدینہ کی مسجد۔[4]

اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ نبی مکرّم ﷺ نے آلاتِ حرب استعمال کئے، انہیں اپنے پاس بھی رکھا اور جنگ و قتال کے کئی طریقے بھی اپنائے۔ ان میں سے کچھ کا تذکرہ پہلے ہو چکا ہے۔

---

[1] مسلم:2957

[2] بخاري:1960 ، مسلم:1136

[3] معجم الكبير للطبراني: ج11ص 172 حديث :11399/قال الهيثمي فى مجمع الزوائد: ورجاله ثقات- ج3 ص271

[4] مسلم :1398

﴿5﴾ اُمّتِ مسلمہ اور ذرائع اِبلاغ کا مسلسل استعمال:

الحمدللہ! مسلمان اپنی طویل تاریخ کے ہر دور میں میسّر وسائل کے استعمال اور ضرورت کے مطابق ان کی اِیجاد میں کبھی بھی دست بستہ نہیں رہے۔ وہ ہر دور کے مطابق دین اور دعوت و تبلیغ کے لئے مفید ذرائع اِبلاغ ایجاد کرتے رہے ہیں مثلاً: حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے قرآنِ مجید کو جمع کیا۔[1] حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ بیان جاری کیا کہ اپنی اولاد کو تیراکی، تیر اندازی اور شاہسواری سکھاؤ۔[2] انہوں نے عدالتیں قائم کیں۔[3] حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے قرآن کے کئی نسخے بنوا کر مختلف شہروں میں تقسیم کئے۔[4] دورِ حاضر کی زبان میں اسے پرنٹ میڈیا کہیں گے۔ حضرت معاویہ رضي اللہ عنہ نے بحری جنگی جہاز بنانے کا حکم دیا۔[5] اسی کو دورِ حاضر میں اسطول (بحری جہازوں کا بیڑا) کہتے ہیں۔

یہ تمام کام ذرائع ووسائل ہیں جو اِسلام کی ہمہ گیریّت اور ہر دور، جگہ اور نسل کو پیش آمدہ نئ صورتِ حال میں اس کے ہم قدم ہو کر چلنے کی دلیل ہیں۔

﴿6﴾ داعی اور مختلف ذرائع کا ارتقائی، ذرائع استعمال کرنے کے فنی اُصول۔

وسائل وذرائع کو استعمال کرنے کے کچھ فنی طریقے ہیں۔ جن سے ان کی تاثیر بڑھ جاتی ہے، ان کا دائرہ عمل وسیع ہو جاتا ہے اور ان کے منفی اثرات ختم ہو جاتے ہیں۔ گذشتہ میں بیان کردہ تفصیل ووضاحت سے ہٹ کر داعی کے لئے مناسب ہو گا کہ وہ ان کے استعمال میں مندرجہ ذیل اُصول وضوابط بھی ملحوظ رکھے۔

1. مختلف اور فائدہ مند قسم کے جو وسائل وذرائع میسّر ہوں انہیں استعمال کرنے میں کوتاہی نہ کی جائے تاکہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کے ساتھ ساتھ اِسلام کی خدمت ہو سکے اور اس کی دعوت عام ہو۔
2. جو ذریعہ اپنایا جائے وہ وقت، جگہ اور مدعوّین کے ماحول کے حسبِ حال بھی ہو۔ ان کی سمجھ سے بالا یا اس سے کم تر ذریعہ نہ اختیار کیا جائے اور نہ ہی ایسے ہو کہ وہ ان کے ماحول سے مناسبت نہ رکھتا ہو۔

---

[1] بخاري :4986

[2] فضائل الرمي ،قراب : 15

[3] احمد ؛فضائل الصحابة: 464،سنن الكبرىٰ للبيهقي: ج6 ص349،350

[4] بخاري :4987

[5] بخاري:2799،2800 ،مسلم:1912

3. تیسرا اُصول یہ ہے کہ وہ ذریعہ ووسیلہ آسان اور واقعاتی صورتِ حال کے مطابق ہو، اس میں تکلّف نہ ہو وگرنہ وہ بذاتِ خود ایک مقصد بن جائے گا۔

ایک داعی کے ذہن میں ہمیشہ یہ بات رہنی چاہیے کہ ذریعہ مقصود بالذّات نہیں ہے وہ تو محض ذریعہ ہے۔ اس کا کام ایک حد تک محدود ہے۔ یہ نہ ہو کہ وہ خود دعوت کا منہج بن جائے یا مضامینِ دعوت پر اثر انداز ہو جائے یا داعی کو دعوت سے ہی ہٹا دے۔ ان میں ایسا تکلف نہیں کرنا چاہیے کہ یہ اصل مقصد سے ہٹا دیں یہ ہلکے پُھلکے اور ماحول کے مطابق ہوں۔ جیسے رسول اللہ ﷺ نے ریت کے ذرّات، کنکریوں، مردہ جانور اور لکڑی کو استعمال کیا۔ یہ تمام اس دور کے وسائل تھے نہ تو آپ ﷺ نے ان کے بنانے میں تکلّف کیا اور نہ ان سے کام لینے میں کوتاہی کی۔ مثلاً دعوتی چارٹ اس حد تک نہ سجائے جائیں اور ان پر ایسی خطّاطی نہ کی جائے کہ ان کا پڑھنا مشکل ہو جائے۔ جائز ڈراموں کی بھی یہی صورتِ حال ہے کیونکہ ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ کسی دینی پہلو کو اُجاگر کیا جائے اور اسے ذہنوں میں مزید راسخ کیا جائے اس لئے ان پر نہ تو زیادہ اخراجات کئے جائیں، نہ انہیں بار بار پیش کیا جائے اور نہ چراغاں کیا جائے اور نہ ضِیاعِ وقت کیا جائے۔ ملبوسات اور تزئین وآرائش میں اسراف سے کام نہ لیا جائے وگرنہ ان کی خرابیاں مطلوبہ مصلحت سے بڑھ جائیں گی۔ کچھ مسلمان بھائی منبروں، گنبذوں، اذان گاہوں وغیرہ میں بھی ایسا تکلّف کرتے ہیں جو انہیں اصل مقصد سے ہٹا دیتا ہے۔

4. وسائل کے ارتقاء سے ہم آہنگی۔

ایک داعی کی دانائی اور سمجھ داری یہ ہے کہ وہ بالخصوص دورِ حاضر میں وسائل وذرائع کے ساتھ ساتھ چلے۔ انہیں اختیار کرنے اور استعمال میں لانے سے پیچھے نہ رہے کیونکہ میدانِ دعوت کو وسیع کرنے میں ان کا بہت اہم کردار ہے۔ بلکہ اسے ان میں بھی جدّت اختیار کرنی چاہیے۔ جس قدر ممکن ہو انہیں نئے انداز میں استعمال کرے۔ گاڑی چل پڑے تو نہ وہ ٹکرانے والے پر رحم کرتی ہے اور نہ پیچھے رہنے والا کا انتظار۔ بہت سے اہلِ علم جو پہلے ریڈیو، ٹی وی اور الیکٹرانک میڈیا کو استعمال میں لانے سے انکار کرتے تھے جب انہوں نے ان وسائل سے پیچھے رہنے کے نقصان کو محسوس کیا تو وہ اپنی رائے بدل کر اسے استعمال کرنے لگ گئے حالانکہ وہ اسے استعمال کرنے والوں پر تنقید کرتے تھے۔

یہ بات مبالغہ سے بالاتر ہے کہ مسلمانوں کو دین کی خدمت اور تبلیغ کے لئے وسائل استعمال کرنے کے حوالے سے تاریخ میں سبقت حاصل رہی ہے۔ اس سے بڑی دلیل کیا ہوگی کہ مسلمانوں نے ہر نئے ذریعہ کو خدمتِ دین اور دعوت و تبلیغ کے لئے استعمال کیا۔ بالخصوص دورِ حاضر میں الیکٹرانک میڈیا، انٹرنیٹ اور کمپیوٹر پروگرامز میں روئے زمین پر دین کی خدمت کے لئے ان سے بڑھ کر کوئی پروگرام نہیں ہیں۔ تفسیر، حدیث، فقہ اور دیگر علوم کے دائرہ ہائے معارف اسی بات کی نشاندہی کرتے ہیں۔

5 ذرائع کے فوائد اور اخراجات کا موازنہ۔

ایک داعی کی بصیرت کی دلیل یہ ہے کہ وہ کسی بھی ذریعے کو اپنانے سے پہلے اس سے حاصل ہونے والے فائدے اور اس پر صرف ہونے والے وقت اور رقم کا موازنہ کرے۔

دورِ حاضر میں آڈیو کیسٹس کے ذریعے لیکچرز محفوظ کرنے کی محنت، اس سے حاصل ہونے والے فائدے کے مقابلے میں نہ ہونے کے برابر ہے جبکہ اونچا اور پُر کشش اسٹیج تیار کرنے یا بلند و بالا اذان گاہ تعمیر کرنے یا بہت بڑا تھیٹر بنانے پر صرف ہونے والے اخراجات، وقت اور محنت کے مقابلہ میں ان سے حاصل ہونے والے فائدے کی کوئی حیثیت نہیں۔

6 ذرائع استعمال کرنے میں علمائے تربیت کا منہج نبوی کیساتھ اتفاق۔

بیان کردہ فنی شرائط کو تمام ہم عصر علمائے تربیت نے بیان کیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے اختیار کردہ وسائل و ذرائع کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں فنی شرائط بدرجہ اُتم موجود ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ آپ ﷺ ان شرائط کو مقرر کرنے میں سب علمائے تربیت کے پیش رو ہیں۔ کاش کوئی نصیحت حاصل کرنے والا ہو۔ آنحضرت ﷺ نے وقت کی مناسبت سے جو ذریعہ میسّر ہوا اسے استعمال کیا اور بہت کامیاب طریقے سے استعمال کیا۔ بکری کے مردہ بچے کو ذریعہ تبلیغ کے طور پر استعمال کرنا اس دور کا یہی ذریعہ ہونے کی بناء پر تھا۔ جو ماحول کے مطابق اور سامعین کے فہم وِادراک کے معیار پر پورا اترتا تھا۔ زمین پر لکیر کھینچ کر اسے تعلیم کے لئے اپنانا بھی اس دور کا بہترین ذریعہ تھا۔ اگر نبی کریم ﷺ کو اس کے علاوہ وائٹ بورڈ اور قلم جیسے ذرائع میسّر آتے تو آپ ﷺ اسے ضرور استعمال کرتے کیونکہ اصل مقصد بات کو واضح کرنا اور لوگوں تک پہنچانا ہے اور یہ دونوں کام نصب کردہ بورڈ کے ذریعے

زمین پر کرنے کی نسبت زیادہ واضح ہوتے ہیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بھی اپنے دورِ خلافت میں آج کے نشر واشاعت کے وسائل میسّر نہ آسکنے پر قرآنِ مجید کو کتابت کرواکر ممکن طریقے سے اسے لوگوں میں تقسیم کیا تھا۔

خلاصہ کلام:

1. مختصر یہ کہ وسیلہ وذریعہ کا حصول جس قدر آسان، کم خرچ، وسیع پیمانے پر کام آنے والا اور زیادہ واضح ہو گا اسی قدر اس کی ضرورت زیادہ ہو گی اور وہ داعی کے لئے باعث مقبولیت ہو گا۔
2. جس قدر اس کا استعمال مشکل، اخراجات زیادہ، محدود پیمانے پر کار آمد اور پیچیدہ ہو گا اتنا ہی اسے چھوڑنا زیادہ مناسب ہو گا۔
3. اسے استعمال نہ کرنا، اس میں تکلّف کرنا یا اس میں مصروف ہو کر رہ جانا ہٹ دھرمی، خلاف سنّت اور فطرت سلیمہ سے متصادم ہے۔ دراصل یہ مسئلہ مصالح ومفاسد کے تصادم کے قواعد سے تعلّق رکھتا ہے جس کی تشریح اپنے مقام پر موجود ہے۔

فصلِ سوم

دعوتِ دین کے اہم ذرائع بالخصوص دورِ حاضر کے ذرائع

کوئی بھی دور دعوتی وسائل سے خالی نہیں رہا اور الحمد للہ مسلمانوں نے انہیں اختیار کرنے میں کوتاہی نہیں برتی بلکہ وہ انہیں کثرت کے ساتھ اور بہتر انداز میں استعمال کرتے رہے ہیں۔ دورِ حاضر میں کچھ جدید وسائل سامنے آئے ہیں جو گذشتہ ادوار میں سامنے نہیں آئے تھے۔

اس فصل میں بیشتر جدید وقدیم وسائل، ان کی اہمیّت، شرعی حیثیت اور ان کے فوائد ونقصانات مختصر طور پر بیان ہوں گے۔

اس فصل کے سولہ مضامین ہیں:

❶ تقریر

لوگوں کے تمام تر طبقات ان کے مختلف اصناف اور مرورِ زمانہ کے باوجود دعوت کے میدان میں اوّلیّت "تقریر" ہی کو حاصل ہے۔

یہ ذریعۂ تبلیغ انتہائی آسان، کم خرچ، زیادہ مقبول اور مفید تر ہے۔ اسی کے ذریعے خود اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو پیدا فرمایا، رسولوں کو بھیجا، امر و نہی کا اہتمام کیا اور موت و حیات کا بندوبست فرمایا۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿إِنَّمَآ أَمۡرُهُۥٓ إِذَآ أَرَادَ شَيۡـًٔا أَن يَقُولَ لَهُۥ كُن فَيَكُونُ ٨٢﴾ یس: ٨٢

"اس کی شان یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو وہ اسے فرما دیتا ہے کہ ہو جا تو وہ ہو جاتی ہے"۔

نیز فرمایا: ﴿وَإِذۡ قَالَ رَبُّكَ لِلۡمَلَٰٓئِكَةِ إِنِّي جَاعِلٞ فِي ٱلۡأَرۡضِ خَلِيفَةٗ ٣٠﴾ البقرة: ٣٠

"اور (یاد کرو) جب تمہارے پروردگار نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں"۔

بیشتر پیغمبروں، ان کے بعد اہلِ علم اور داعیانِ حق نے زبانی ذریعۂ تبلیغ ہی کو اختیار کیا، یہ وعظ و نصیحت کی صورت میں ہو یا درس اور لیکچر کی شکل میں یا پھر اَمر و نہی کے انداز میں۔

❷ قلم و قرطاس

زبانی تبلیغ کے بعد سہولت اور فائدے کے لحاظ سے یہ دوسرا بڑا ذریعہ ہے۔ بلکہ معلوماتی لحاظ سے یہ تقریر سے زیادہ پائیدار ہے۔ اللہ عزّوجل نے پہلے اسی وسیلے کو پیدا کیا اسی کے ذریعے لوحِ محفوظ کو تحریر فرمایا۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿وَلَقَدۡ كَتَبۡنَا فِي ٱلزَّبُورِ مِنۢ بَعۡدِ ٱلذِّكۡرِ أَنَّ ٱلۡأَرۡضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ ٱلصَّٰلِحُونَ ١٠٥﴾ الأنبياء: ١٠٥

"اور ہم نے نصیحت (کی کتاب تورات) کے بعد زبور میں لکھ دیا ہے کہ زمین کے وارث میرے نیک بندے ہی ہوں گے"۔

ان دو وسائل کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ نہ ہی ان کی شرعی حیثیّت اور ان کے فوائد بیان کرنے کی اتنی ضرورت ہے کیونکہ یہ سب کے ہاں مسلّمہ ذرائع ہیں۔ ان کی اہمیّت واِفادیّت اور

شرعی حیثیّت کسی سے بھی مخفی نہیں۔

ذریعہ کتابت کی بہت سی شکلیں ہیں۔ یہ ذریعہ نوعیّت، مقدار اور شکل وصورت کے لحاظ سے بہت زیادہ ترقی کرچکا ہے۔ آئندہ اس میں سے کچھ کی تفصیل بھی بیان ہورہی ہے۔

❸ پمفلٹ اور بروشر

اس سلسلہ میں تین عنوانات ہیں:

❶ تعارف واہمیّت۔

مختصر تحریروں سے مراد کم حجم کتابیں اور بروشر ہیں۔ جنہیں سفر وحضر میں آسانی سے ساتھ رکھا جاسکتا ہو اور دن اور رات میں کسی بھی وقت زیرِ مطالعہ لایا جاسکتا ہو چونکہ اس ذریعہ تبلیغ میں کامیابی کے بہت سے پہلو ہیں۔ اسی لئے اسے مفید سمجھا جاتا ہے۔

❷ فوائد ونقصانات۔

ضرورت کے وقت انہیں اٹھانا اور پاس رکھنا آسان ہے۔ مدعو جب چاہے آسانی سے ان کا مطالعہ کرسکتا ہے ان میں اکثر لوگوں کے سفر وانتظار کے فارغ اوقات کا مصرف بھی موجود ہے۔

انہیں کسی اجتماعی جگہ اور انتظار گاہ میں بھی رکھا جاسکتا ہے جہاں سے عوام النّاس بلا تکلّف انہیں حاصل کرسکتے ہوں۔ کم خرچ ہونے کی وجہ سے ان کی اشاعت آسان ہے۔ یہ دورِ حاضر میں لوگوں کے حالات کے بھی مطابق ہے کیونکہ وہ بڑی کتابیں پڑھنے کا شوق نہیں رکھتے یا ان کی استطاعت نہیں رکھتے۔

نقصانات: عوام النّاس کے کم علم ہونے کی وجہ سے ان میں خلافِ کتاب وسنّت مواد پائے جانے کی بنا پر گمراہ ہونے کا اندیشہ ہے۔

❸ کامیاب پمفلٹ اور بروشر کی شرائط۔

اس ذریعۂ تبلیغ کی کامیابی کے لئے درج ذیل باتوں کالحاظ ضروری ہے۔

- ✰ ان میں دعوتی مواد ہوناچاہیے، علمی اور دقیق باتیں نہ ہوں۔
- ✰ ان کے الفاظ آسان ہوں تاکہ عام قاری اسے سمجھ سکے۔

☆ ان کا انداز سادہ ہو تاکہ سب کی سمجھ میں آسکیں۔

☆ بڑے خط میں تحریر ہوں تاکہ کمزور نظر لوگ بھی پڑھ سکیں۔

☆ انہیں لوگوں کی آمد ورفت کی جگہوں میں رکھا جائے۔

اس طرح یہ زیادہ مفید ہوسکتے ہیں۔

❹ نشریات

اس میں تین عنوانات ہیں:

❶ نشریات کی اہمیت۔

دورِ حاضر کے جدید ذرائع میں سے ریڈیو نشریات بھی ہیں۔ اگرچہ پہلی اقوام میں بھی ان کا کچھ وجود تھا وہ لوگ شہروں، دیہاتوں اور بازاروں میں حکمرانوں کا حکم نامہ اور قبیلے کا پیغام پہنچانے کے لئے منادی بھیجا کرتے ہیں۔ اگرچہ ترقی یافتہ شکل میں اور وسیع پیمانے پر اس کا وجود پہلے ادوار میں نظر نہیں آتا۔

ریڈیائی اِبلاغ سے مراد یہ ہے کہ برقی تار کے بغیر چلنے والے آلات کے ذریعے اوراسی طرز کے دوسرے آلات تک فضائی لہروں کی وساطت سے پیغام رسانی کرنا۔ حالانکہ اس سے زیادہ پُرکشش اور زیادہ وسیع علاقے تک پیغام رسانی کے لئے ٹی وی اور انٹرنیٹ جیسے نئے ذرائع ایجاد ہوچکے ہیں۔ اس کے باوجود ریڈیو کا کِردار برابر چلا آرہا ہے۔

ٹرانسپورٹ کے مسافروں، فیکٹری کے کارکنوں، دوکانداروں اور گھریلو خواتین کی صورت میں اسے سننے والوں کی تعداد مسلسل موجود ہے۔ یہ لوگ اور ان جیسے دیگر افراد اکثر وبیشتر اپنی ذمہ داری نبھاتے ہوئے کتابوں اور چینلز وغیرہ کے دعوتی ذرائع استعمال نہیں کرسکتے جب کہ وہ ریڈیو کو بآسانی سن سکتے ہیں۔

❷ نشریات کی موجودہ صورت حال اور ان میں شرکت کی حیثیت۔

ریڈیائی نشریات منبع وسرچشمہ کے لحاظ سے دوطرح کی ہوتی ہے:

(۱) سرکاری (۲) پرائیویٹ

اُسلوب اور منہج کے اعتبار سے بھی کچھ تو سرکاری ہوتی ہیں۔ جو حکومتی سیاست کی ہی نمائندگی کرتی

ہیں۔ کچھ سیاسی کچھ تجارتی اور کچھ مذہبی ہوتی ہیں۔ یہ تمام تر قسمیں کچھ اچھی ہوتی ہیں اور کچھ بُری۔

دینی اور تجارتی نشریات میں حصّہ لینے میں تو کوئی اعتراض نہیں ہے۔ جہاں تک حکومتی اور سیاسی نشریات میں حصّہ لینے کا تعلق ہے تو ان میں فوائد و نقصانات میں تقابل کے اُصول کو ملحوظ رکھنا ہو گا اگر ان میں شمولیت سے نقصانات ہوں مثلاً مذہبی بے حرمتی کا عنصر ہو یا سامعین کو دھوکہ دینے کا پہلو ہو تو انہیں نہ اپنایا جائے کیونکہ یہ ایک طے شدہ اُصول ہے کہ نقصانات سے بچنا مفادات کے حصول سے مقدّم ہے۔

اگر ان میں شمولیت کے فوائد زیادہ ہوں اور نقصانات یا تو بالکل نہ ہوں یا فوائد کے مقابلہ میں نہ ہونے کے برابر ہوں تو ان میں شمولیت کرنے پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔

ایسی بدبودار نشریات جو شر اور فساد عام کریں اور شریعت کی مخالفت کریں داعی حضرات کو ان میں شمولیت نہیں کرنی چاہیے کیونکہ اس میں فسادیوں کی تعداد میں اضافے اور سامعین عوام کو دھوکہ دہی کا پہلو ہے۔

3 کامیاب موضوعات کی خوبیاں۔

یہ ایک پُر حکمت اور دانائی پر مبنی بات ہے کہ ریڈیائی نشریات، ٹی وی چینلز اور صحافت جیسے ذرائع اِبلاغ اختیار کرکے دعوت دینے کے لئے مندرجہ ذیل اُمور کو ملحوظ رکھا جائے۔

- ☆ موضوعات عوامی ہونے چاہئیں جن کا ملک وملّت کے ساتھ ربط اور تعلق ہو۔ اُمّت مسلمہ کو درپیش جہالت اور ایمانی کمزوری کے مسائل کا حل پیش کریں۔
- ☆ عقائد کے دقیق مسائل، اصول فقہ، اصول حدیث، منطق وفلسفہ جیسے مسائل جن کا تعلّق خاص لوگوں کے ساتھ ہے انہیں بیان نہ کیا جائے۔ ان مسائل سے بھی گریز کیا جائے جو امّت میں تفریق ڈالنے یا علمی و عملی فتنے پیدا کرنے کا باعث ہوں۔ کچھ نشریات میں عقیدے کے فروعی اور پیچیدہ مسائل پیش کئے جاتے ہیں مثلاً کیا اسم اور مسمّیٰ دونوں ایک ہی چیز ہیں یا اس سے ملتے جلتے۔ وہ مسائل جنہیں عوام النّاس سمجھ بھی نہیں پائے اور انہیں ان کی ضرورت بھی نہیں ہے ترجیحی پہلو سے دیکھا جائے تو انہیں بیان کرنا مناسب نہیں ہے۔

☆ ایک داعی کے لئے گذشتہ میں بیان کردہ اُصول کے مطابق ضروری ہے کہ اس کا انداز بیان سادہ ہو، الفاظ آسان ہوں خواہ اسے ضرورت کے وقت عوامی زبان کیوں نہ استعمال کرنا پڑے۔ فلسفیانہ انداز اختیار کرنے سے بچنا چاہیے۔ اس سے سامعین کو کوئی فائدہ نہیں ہوتا کیونکہ ان میں مردوزن، چھوٹے بڑے، عوام النّاس، مہذّب شہری، دیہاتی اور ہر قسم کے افراد ہوتے ہیں۔ اسے وضاحتی مثالیں اور عبرت آموز واقعات بیان کرنے سے غفلت نہیں برتنی چاہئے جیسا کہ یہ تمام باتیں عُمدہ اندازِ بیان کے باب میں ذکر کی جاچکی ہیں۔

5 ویڈیو چینلز

اس میں تین عنوانات ہیں:

1 اہمیّت و مفہوم۔

آج کل مقامی اور بین الاَقوامی چینلز سب سے بڑا ذریعہ اِبلاغ اور لوگوں کی توجّہ کا مرکز ہیں۔ یہ باقی تمام ذرائع ووسائل پر حاوی ہوچکے ہیں۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ انسانی مزاج کچھ ایسا واقع ہوا ہے کہ وہ آواز اور تصویر دونوں کی بیک وقت موجودگی کو پسند کرتا ہے جبکہ چینلز میں اس کے ساتھ ساتھ اُسلوب کا تنوّع، پیش کردہ مضامین کا ذخیرہ اور اندازِ بیان انتہائی پُرکشش ہوتا ہے۔

2 ٹی وی اور ویڈیو استعمال کرنے کی شرعی حیثیت۔

ان میں حصّہ لینے والے کی شرعی حیثیّت اور مختلف صورتوں میں اس کی مختلف حیثیتیں دیگر نشریات ہی کی طرح ہیں۔ تصویر کی حُرمت کے پیشِ نظر ایسی دیگر قباحتوں کو دلیل بنا کر اس سے گریز کرنا درست نہیں ہے۔

اس نقطۂ نظر کے بہت سے حاملین نے اس سے رجوع بھی کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگرچہ تصویر حرام ہے لیکن اس کی حرمت کی اصل وجہ یہ ہے کہ یہ ناجائز کاموں کا سبب بنتی ہے جبکہ ایسی چیز اس صورت میں جائز ہوجاتی ہے جب اس پر کوئی بڑا شرعی فائدہ مرتّب ہورہا ہو جیسا کہ گذشتہ اوراق میں وضاحت سے بیان کیا جاچکا ہے۔

بلاشبہ ٹی وی چینلز کے ذریعے دعوتِ دین کا کام ترجیحی بنیادوں پر اور اچھے انداز میں ہوسکتا ہے۔ اگر

اس ذریعہ ابلاغ کو اختیار نہ کیا جائے تو اس سے کار دعوت میں بہت بڑا خلا پیدا ہو جائے گا جسے گمراہ اور فاسق لوگ ہی پُر کریں گے۔

3 مثبت اور منفی اثرات۔

مثبت اثرات:

- ☆ دیکھنے اور سننے والوں کا ایک جم غفیر اکٹھا ہو جاتا ہے۔
- ☆ لوگوں میں وسیع پیمانے پر ہر بات پہنچ جاتی ہے۔ وہ ان کے گھروں، بازاروں اور تفریح گاہوں تک جا پہنچتی ہے۔
- ☆ بہت سے لوگوں کے فارغ اوقات مصروف ہو جاتے ہیں اور انہیں فضول اور مضر چیزوں کو چھوڑ کر مفید کام میں مصروف کر دیتا ہے۔

منفی اثرات:

- ☆ ان میں خلافِ شریعت چیزوں کی موجودگی یا پھر اکثر پروگراموں میں فساد اور بگاڑ کا پایا جانا اس کا منفی پہلو ہے کہ اس سے اکثر و بیشتر اوقات آدمی کے پھسلنے کا اندیشہ ہوتا ہے۔
- ☆ داعی حضرات کے ان میں حصّہ لینے کی بناء پر عوام النّاس اسے دیگر پروگرام دیکھنے کا جواز بنا لیتے ہیں۔
- ☆ تبلیغ ودعوت کے میدان میں نااہل لوگوں کے آجانے سے عوام گمراہ ہو جاتے ہیں۔ جب کہ بیشتر حالات میں داعی کا ان ذرائع کو اپنانا مختلف اسباب پر منحصر ہوتا ہے۔

6 رسائل وجرائد

اس میں تین عنوانات ہیں:

1 رسائل وجرائد کی اہمیت۔

عصرِ حاضر کی نشریات میں اخبارات وجرائد کے اثرات اور اہمیت محتاج بیان نہیں ہیں۔

ہم دیکھتے ہیں کہ جہاں داعی حضرات کا جرائد کے اِجراء میں نمایاں اثر ہے وہاں بیشتر اخبارات میں ان کی محنت مسلسل کمزور بلکہ ناپید نظر آتی ہے۔ اخبارات کا اِجراء ایک یا دو افراد کا کام نہیں ہے۔ اس کے لئے

دعوتی اداروں کی ضرورت ہے کیونکہ اس میں اخراجات کے ساتھ ساتھ بہت زیادہ فنّی اور علمی محنت درکار ہوتی ہے۔

2 رسائل وجرائد میں شرکت اور ان کے حصول کی شرعی حیثیت۔

شریعتِ اِسلامیہ کی نظر میں ریڈیو اور ٹی وی نشریات کے پروگرام جو حیثیت رکھتے ہیں وہی حیثیت اخبارات وجرائد کو حاصل ہے۔ دونوں کے مسائل کی توجیہات میں مماثلت پائی جاتی ہے۔ ان ذرائع دعوت میں اِشکال کا پہلو یہ ہے کہ ان میں سے اکثر وبیشتر میں اِسلامی امتیازات نہیں ہیں۔ یہ ایک کتاب کی طرح نہیں ہے جس کے بارہ میں پڑھنے یا نہ پڑھنے کی ہدایت کی جاسکے۔ ان میں اِصلاحی اور غیر اِصلاحی دونوں طرح کا مواد اس قدر ملا جُلا ہے کہ ان کی شرعی حیثیت کا تعیّن بہت مشکل ہے۔

ایک مسلمان کے لئے بہتر یہ ہے کہ وہ ایسے ذرائع اختیار نہ کرے اور وہ ان قواعد پر عمل پیرا ہو۔

- ''وَمَنْ حَامَ حَوْلَ الْحِمٰی ، یُوْشِكُ أَنْ یَّقَعَ فِیْهِ''
  جو شخص چراگاہ کے گرد چکر کاٹتا ہے وہ اس میں داخل بھی ہو سکتا ہے۔[1]
- فوائد حاصل کرنے کی نسبت خرابیوں سے بچنا مقدّم ہے۔

3 رسائل وجرائد کے فوائد ونقصانات۔

ان کے وہی فوائد ہیں جو پمفلٹس اور بروشرز کے ضِمن میں بیان ہو چکے ہیں جبکہ ان کے نقصانات مندرجہ ذیل ہیں:

- ان میں رَطب ویابس اس قدر ہے کہ عوام النّاس کے لئے ان میں صحیح وغلط کا امتیاز کرنا مشکل ہے۔
- فساد اور بگاڑ پر مشتمل مضامین پڑھ کر قاری کے پھسلنے کا اندیشہ ہوتا ہے اور وہ اس کے مذہب کو متاثر کر سکتے ہیں۔

جس شخص نے یہ تبصرہ کیا ہے کہ جس قدر اَخلاقی بگاڑ اور فکری انحراف پایا جاتا ہے اس میں سے زیادہ تر مختلف ذرائع اِبلاغ کی پیداوار ہے اس نے کوئی مبالغہ نہیں کیا۔ آپ خود ہی اندازہ لگائیں کہ چینل

---

[1] بخاري:52، 2051، مسلم:1599

سسٹم کے ذریعے کس قدر اَخلاقی تباہی اور فِکری بربادی ہوچکی ہے۔

کیونکہ اس سے قبل مسلمانوں کے افکارو خیالات میں دیگر افکار کی نہ اس قدر مداخلت تھی اور نہ اتنے وسیع پیمانے پر اَخلاقی بگاڑ موجود تھا۔ اس لئے یہ کام انتہائی ضروری ہوگیاہے کہ ان ذرائع اِبلاغ کا مقابلہ اِسلامی اور مفید ذرائع اِبلاغ کے ذریعے کیا جائے۔

❼ درس، لیکچر، سیمینار۔

اس میں تین عنوانات ہیں:

❶ اہمیت اور تعارف۔

یہ ذرائع دعوت کے میدان میں نئے نہیں ہیں تاہم ان میں ترتیب، خاکہ سازی اور اِظہارِ خیال کی عمدگی کے لحاظ سے جِدّت پیدا ہوئی ہے۔

درس ایک جانا پہچانا طریقہ ہے جس میں ایک محدود وقت اور ایک مخصوص جگہ میں ایک صاحبِ علم مسلسل تعلیمی مضمون پیش کرتا ہے۔

لیکچر ایک خاص اندازِ دعوت ہے۔ جس میں ایک طے شدہ موضوع پر ایک مقرر ایک ہی نشست میں ایک جگہ محدود وقت میں اپنے خیالات پیش کرتا ہے۔

سیمینار میں لیکچر دینے والے ایک یا زیادہ حضرات اور سیمینار منعقد کرنے والے ذمہ داران کا باہمی تعاون ہوتا ہے۔ اس ذریعۂ دعوت کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں لوگوں تک معلومات پہنچانے کو زیادہ اہمیّت دی جاتی ہے۔ بلکہ یہ طریقۂ کار تعلیم دینے اور ایک دوسرے تک علم پہنچانے میں بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔

علاوہ ازیں لیکچرز کی اہمیّت اس طور سے بھی زیادہ ہوتی ہے کہ اس میں ایک ہی علمی پہلو یا مخصوص دعوتی نکتے پر زور دیا جاتا ہے جس سے علمی اور دعوتی اثرات زیادہ ہوتے ہیں۔

❷ دروس کے فوائد ونقصانات۔

فوائد:

درس اور وعظ کا اہم ترین فائدہ یہ ہے کہ یہ ریگولر طالب علم کو ایک مضبوط علمی استفادہ فراہم کرتے

اور اسے کثیر التعداد فقہی مواد بہم پہنچاتے ہیں۔ اسے علم و جُستجو کے صحیح راستے پر چلاتے ہیں۔ یہ دروس تہذیب و وقار کا باعث ہیں اور سوچ و بچار میں نکھار پیدا کرتے ہیں۔

نقصانات:

دروس میں کچھ خامیاں بھی ہیں مثلاً:

- ✮ یہ ایک جامد طریقہ ہے۔
- ✮ اس میں باہمی گفتگو کا پہلو نہیں ہے اس لئے یہ طالب علم میں مطلوبہ چیز سمجھنے کی صلاحیت پیدا نہیں کرتا اور نہ ہی اس کے ذہن میں آمدہ شبہات کا اِزالہ کرتا ہے۔
- ✮ یہ طریقہ علمی اَساس فراہم کرنے کے لحاظ سے بھی کمزور ہے، طالب علم کتاب و سنّت کے حقیقی علم سے دور رہ کر محض اس کے اِرد گرد مصروف رہتا ہے۔
- ✮ یہ طریقہ اپنانے والے طلبہ نہ تو مسائل اِستنباط کرسکتے ہیں اور نہ ہی مختلف اقوال میں ترجیح کی اِستعداد سے بہرہ ور ہوتے ہیں۔
- ✮ طلبہ کو تقلیدانہ رویّے کا عادی بنا دینے سے ان میں غور و فکر کا داعیہ ختم ہو جاتا ہے اور وہ اجتہادی صلاحیت سے محروم ہو جاتے ہیں۔ صورتِ حال یہ ہو جاتی ہے کہ کچھ طلبہ آیاتِ احکام کی تفسیر اور احادیث کو پہنچانتے بھی نہیں۔
- ✮ اس طریقِ کار میں عملی تربیت میں بھی کمزوری پائی جاتی ہے کیونکہ اس کا تمام تر زور معلومات جمع کرنے پر ہے۔
- ✮ اس میں دعوتی پہلو سے کردار سازی کا اہتمام نہیں ہے اور نہ ہی طلبہ کی عملی مشق کی طرف توجّہ دلائی جاتی ہے۔

❸ لیکچر کے فوائد و نقصانات۔

لیکچر کا انداز اپنانے کے بہت سے فوائد ہیں، مثلاً:

کسی ایک موضوع کو پُر از معلومات علمی اُسلوب میں پیش کیا جاتا ہے۔ جس میں لیکچر دینے والا درجہ بدرجہ اپنی فکر اور اس کے دلائل پیش کرتا ہے اور فکرِ مخالف کے جوابات دیتا ہے۔ یہ اکثر و بیشتر ایک ہی

معیار کے سامعین کے لئے ہوتا ہے اس کے بعد کچھ سوالات ہوتے ہیں۔ اس سے سامعین کی فکر مجتمع ہو کر فیصلہ کُن نتیجے تک پہنچتی ہے۔

سیمینار بھی لیکچر ہی کی طرح ہوتا ہے۔ دونوں کا باہمی فرق یہ ہے کہ سیمینار میں بیک وقت ایک سے زیادہ مقرر ہوتے ہیں۔ وہ بھی ایک ہی وقت میں ایک ہی موضوع پر ہوتا ہے اس سے سامعین کی معلومات فزوں تر ہو جاتی ہیں۔ کیونکہ اس میں فکری تنوّع اور شرکت کرنے والوں کے مختلف اُسلوب ہوتے ہیں۔

دعوتِ دین میں اس ذریعے کو اپنا کر داعی حضرات نے ایک مؤثر کردار ادا کیا ہے اور وہ بہت سے دعوتی مسائل حل کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔

اس ذریعہ دعوت کے کچھ منفی پہلو بھی ہیں، مثلاً:

- ✩ کچھ شرکاء دائرۂ دعوت سے نکل کر غیر دعوتی مسائل میں پڑ جاتے ہیں۔
- ✩ کچھ حضرات فکری رائے کو تنگ کر لیتے ہیں۔ جس سے دعوت پر منفی اثرات ہوتے ہیں اور بہت سے علاقوں میں لیکچرز اور سامعین کی تعداد میں کمی واقع ہوتی ہے۔
- ✩ اس کا ایک اور منفی پہلو یہ ہے کہ اب بھی عوام النّاس داعی حضرات اور ان کے موضوعات کو اہمیت نہیں دیتے۔ بیشتر لیکچر نسل نو کی بیداری اور ان کے گرد دائر ہوتے ہیں۔

❽ کانفرنس

اس کے تین عنوانات ہیں:

❶ اہمیّت اور تعارف۔

کانفرنس سے مراد ایک موضوع سے متعلق مختلف لیکچرز کا تسلسل ہے جو ایک محدود وقت میں دیئے جاتے ہیں۔ اکثر و بیشتر یہ چند دنوں پر مشتمل ہوتی ہیں۔

ان میں لیکچر دینے والے ایک منتخب موضوع پر اپنے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔

عصرِ حاضر میں یہ ذریعۂ دعوت بہت عام ہو چکا ہے۔ نوجوان اور مہذّب لوگوں کی توجّہ اس طرف بڑھ گئی ہے۔ ان کانفرنسوں کے مسلمانوں پر دعوتی اثرات بھی ہوتے ہیں اور معاشرتی بھی۔ بالخصوص یورپی

ممالک میں ان کے اثرات زیادہ ہیں۔

2 مثبت پہلو۔

☆ اس سے نظریات کا باہمی تبادلہ ہوتا ہے۔ اس سے مسلمانوں میں بالعموم اور لیکچر دینے والوں میں بالخصوص فکری تعاون کی راہ پیدا ہوتی ہے۔

☆ ان لیکچرز کا سامعین پر دعوتی اور علمی اثر ہوتا ہے اور انہی سے یہ فائدہ دیگر افراد میں منتقل ہوتا ہے۔

☆ کانفرنس کے دوران حاضرین پر ذہنی اور معاشرتی اثرات مرتّب ہوتے ہیں۔

☆ مسلمانوں کو آپس میں افکار اور شخصیات کے حوالے سے تعارف کا موقع ملتا ہے۔

☆ یہ انداز اسلام اور مسلمانوں کی قوّت کا مظہر ہے۔ مسلم اور غیر مسلم ان کانفرنسوں سے اسلام کی طاقت بالخصوص علمی طاقت اور لوگوں کی آراء سے آشنا ہوتے ہیں۔ اور یہیں سے کچھ غیر مسلم اپنے دین کو خیر باد کہتے ہیں۔

☆ اس سے عالمِ اسلام کے بہت سے مسائل کا حل یا حل کے بارہ میں سوچنے کا موقع ملتا ہے۔

☆ بہت سے مسلمانوں بالخصوص مغرب میں رہنے والے مسلمانوں کو اس کے ذریعے دینی اور اجتماعی مشکلات سے نکلنے کے راستے دریافت ہوتے ہیں۔

3 منفی پہلو۔

☆ ان میں پیش کردہ علمی مواد بہت کم ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں منہج اور عقیدے کا پہلو کمزور ہوتا ہے۔

☆ ان میں عملی پہلوؤں کی طرف توجّہ نہیں دلائی جاتی اس لئے یہ دعوتی نقطۂ نظر سے بطورِ خاص صرف نظریاتی چیز بن کر رہ جاتی ہے۔

☆ کانفرنسوں میں طے شدہ قراردادوں پر اکثر وبیشتر عمل نہیں ہوتا اور یہ محض کاغذ کی تحریر کی حد تک محدود ہوتی ہیں۔

☆ ان میں پیش کردہ باتوں کو کتاب وسنّت سے مدلّل کرنے کی پابندی نہیں کی جاتی جس کی وجہ سے

پیش کردہ موضوع میں تضاد آجاتا ہے۔ اور یہ چیز سامعین کو بے چینی میں مبتلا کر دیتی ہے اور اس سے متعلّقہ افراد میں خطرناک قسم کی منہجی اغلاط پیدا ہو جاتی ہیں۔

☆ ظاہری چیزوں پر اسراف کی حد تک توجّہ دی جاتی ہے۔ داعی حضرات عجز وانکساری کے مظہر سے خالی ہو جاتے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ غریبوں کے احساسات مجروح ہوتے ہیں۔

☆ اکثر وبیشتر کانفرنسیں محض سیاسی انداز اختیار کر لیتی ہیں۔ حالات وواقعات کو شریعت کے مقاصد اور کتاب وسنّت کے منہج سے دور رہ کر زیرِ بحث لایا جاتا ہے۔ کچھ موضوعات میں فرقہ واریت کا طریقہ اختیار کرنے کی بناء پر ان میں جامعیت اور وسعت کو ختم کر دیا جاتا ہے اور انہیں مزید آگے بڑھنے سے روک دیا جاتا ہے۔

❾ **ورکشاپ:** اس میں تین عنوانات ہیں:

❶ **تعریف اور اہمیت۔**

تعلیمی ورکشاپ سے مراد ایک محدود وقت میں طے شدہ خاکہ کے مطابق دیئے جانے والے لیکچرز ہیں۔ یہ وقت کم بھی ہو سکتا ہے اور زیادہ بھی۔

طالب علم اس سے خاصہ مستفید ہوتا ہے۔ دعوت کا یہ طریقِ کار عصرِ حاضر میں زیادہ مقبول اور مفید ثابت ہو رہا ہے۔ اس انداز کی طرف لوگوں کی توجّہ زیادہ ہے۔ اس کی اہمیّت کا راز اس کے مثبت پہلوؤں میں مضمر ہے۔

❷ **مثبت پہلو۔**

☆ طالب علم تھوڑے وقت میں اور بہت سے علوم میں زیادہ علمی استفادہ کر لیتا ہے۔

☆ اس کا دوسرا فائدہ یہ ہے کہ نوجوانوں کو مصروف رکھا جاتا ہے بالخصوص چھٹیوں کے دوران۔

☆ اس میں مختلف ذرائع سے حصول علم کا موقع ملتا ہے۔

☆ اسی طرح حکومتی جامعات اور اداروں سے استفادہ نہ کر سکنے والوں کے لئے حصولِ علم کی سہولت فراہم ہوتی ہے۔

❸ **نقصانات:** ورکشاپ کے منفی اثرات بھی مدِّ نظر رہنے چاہئیں:

☆ اس میں منہج سے متعلّقہ مسائل پر توجّہ نہیں دی جاتی یہی وجہ ہے کہ نوجوان اسے اپناتے وقت زیادہ

ترنادرست ذرائع اختیار کرتے ہیں۔

☆ اس میں اس اُصولی اور بنیادی پہلو کا اہتمام نہیں ہوتا جسے کتاب کی تمہید میں بیان کیا گیا ہے اس میں زیادہ تر دروس اضافی حیثیت سے پیش کئے جاتے ہیں۔

☆ اس طریقے کی عملی خامی یہ ہے کہ اس میں نظریات کو عملی طور پر منطبق نہیں کیا جاسکتا۔

☆ اس میں چوتھی خامی یہ ہے کہ یہ طریقِ کار ایسے دعوتی انداز سے خالی ہے جس میں دعوت کو حقیقت پسندانہ طریقے اور اُسلوب سے پیش کیا جارہا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ طلباء کرام یادداشت کے حوالے سے تو ایک حد تک علمی استفادہ کرلیتے ہیں لیکن فہم، اجتہاد اور دعوتِ دین کی اہلیّت کے حوالے سے کمزور ہوتے ہیں جبکہ منہج کی کمزوری اس سے بھی زیادہ ہوتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ حالات کے جھونکے انہیں دائیں بائیں ہلاتے رہتے ہیں۔

ان سب چیزوں کے باوجود یہ تعلیمی ورکشاپ مکمل اور کثرت کے ساتھ ہونی چاہئیں کیونکہ ان میں بہت زیادہ فائدہ اور خیر وبرکت ہے۔

⑩ **آڈیو، ویڈیو کیسٹیں:** اس میں تین عنوانات ہیں:

❶ **اہمیت۔**

ان ذرائع ووسائل میں سے ہر ایک کا اپنا ایک میدانِ عمل ہے اور یہ بہت بڑے خلا کو پُر کرتے ہیں، آڈیو کیسٹ کا بہت بڑا کردار ہے جس کا انکار نہیں ہوسکتا، اسی طرح ویڈیو کی اہمیّت بھی اپنی جگہ مسلّمہ ہے ، یہ کیسٹیں چلتا پھرتا علم ہے، یہ گھومتے پھرتے اہلِ علم ہیں۔ یہ تو متلاشی علم اور طالبِ ہدایت کے ساتھ اس کی پسند کے مطابق سفر کرنے والے معلّم ہیں۔

❷ **مثبت پہلو۔**

☆ یہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو مصروف کرتی ہیں، جن میں مسافر، گھریلو خواتین، فیکٹریوں کے مزدور، دفتروں کے ملازم اور مختلف انتظار گاہوں میں موجود افراد بھی آجاتے ہیں۔

☆ اس میں ہر شخص کے لئے مَن پسند موضوع کا آپشن پایا جاتا ہے۔

☆ یہ طریقہ سفر وحضر میں، چلنے پھرنے کے دوران ، اُٹھتے بیٹھتے ہوئے، خشکی وتری میں ، گھر کی

چاردیواری میں اور اس سے باہر اپنانا آسان ہے۔ انفرادی اور اجتماعی دونوں طرح سے اس سے استفادہ ممکن ہے۔

☆ اس کے وسائل وذرائع کا حصول بھی آسان ہے۔ عصرِ حاضر میں آڈیو، ویڈیو کے آلات کو حاصل کرنا قیمت کے حوالے سے بھی بیشتر لوگوں کے لئے ممکن ہو چکا ہے۔

☆ کسی بھی جگہ پر علمی اور دعوتی نشست اسے دیکھنے یا سننے کے لئے لگائی جاسکتی ہے۔ گھر کا سربراہ افرادِ خانہ کو جمع کر کے، استاد طلبہ کے ساتھ بیٹھ کر، آفس انچارج اپنے عملے کے ساتھ کسی بھی لیکچر کو سن سکتا ہے، اس پر تبصرہ کر سکتا ہے، اس پر رائے دے سکتا ہے، سامعین وناظرین کو اظہار رائے کا موقعہ دے سکتا ہے۔ میدانِ علم میں ایک دوسرے کو نصیحت کرنے اور علمی فوائد کے حصول جیسے کام بھی لے سکتا ہے۔ کیونکہ اس میں بڑی خوبی من پسند انتخاب ہے۔ ان خوبیوں کے پیش نظر اس ذریعہ اِبلاغ نے دعوتِ دین کے میدان میں بھرپور اور بنیادی کردار ادا کیا ہے۔

4 منفی پہلو۔

☆ اس کے اخراجات غریب ممالک میں اس کے عام ہونے کے لئے اب بھی رکاوٹ ہیں، تاہم اس مشکل پر اس طرح قابو پایا جاسکتا ہے کہ ان کے اخراجات برداشت کرنے کے لئے اہلِ خیر کی طرف سے حوصلہ افزائی ہو تا کہ انہیں ایسے علاقوں میں تقسیم کیا جائے۔

☆ اس کا دوسرا منفی پہلو یہ ہے کہ یہ ایک کُھلا میدان بن گیا ہے جس میں ہر زید و بکر چل نکلتا ہے اور جو چاہے کہہ گزرتا ہے۔ اس سے بہت زیادہ نقصان ہوتا ہے۔ اس بات پر قابو پایا جانا انتہائی مشکل ہے تاہم شرعی اُصول بندی اور مذہبی بیداری کے ذریعے اس کا انسداد ممکن ہے اس کے لئے ہر مسلمان کو اپنا فرض ادا کرنا ہو گا۔

☆ اس کا ایک اور منفی اثر یہ ہے کہ ان کے عام استعمال کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ اہلِ علم کے دروس اور نشستوں میں حاضری کی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی جس سے تربیت میں کمی اور علم نہ ہوتے ہوئے بھی اس کے خیال جیسے مسائل پیدا ہوئے ہیں۔



موسمِ حج میں المدینہ اسلامک ریسرچ سینٹر کی خدمات

عثمان صفدر [1]

حج ارکان اسلام کا ایک اہم ترین رکن ہے، ایک ایسا مبارک عمل ہے جو کئی اہم اعمال کے مجموعہ پر مشتمل ہے، اس کی جزا صرف اور صرف جنت ہے، جس کا حج قبول ہو جائے وہ گناہوں سے ایسے پاک ہو جاتا ہے جیسے نومولود بچہ ہو، وقوف عرفہ جیسا عظیم عمل اس کا بنیادی رکن ہے، جسے نبی مصطفی ﷺ نے خواتین کے لئے جہاد قرار دیا ہے، جس کی ابتداء تلبیہ اور انتہاء قربانی ہے، جس کا محور توحید کی سربلندی ہے، جس میں جابجا مساوات، بھائی چارہ اور ایک دوسرے کے احترام کا سبق ہے۔
ہر سال لاکھوں مسلمان صدائے ابراہیمی پر لبیک کہتے ہوئے اس فرض کو انجام دیتے ہیں، اور خادم الحرمین الشریفین کی جانب سے حجاج کرام کی بہترین خدمت اور مہمان نوازی کی بدولت اس تعداد میں ہر سال اضافہ دیکھنے میں آرہا ہے۔ پاکستان سے بھی ہر سال تقریباً ڈیڑھ لاکھ حجاج کرام سوئے حرم روانہ ہوتے ہیں۔

دیار حرمین میں بسلسلہ تعلیم قیام کے دوران راقم الحروف اور دیگر ساتھیوں کے مشاہدہ میں یہ بات رہی کہ حجاج کرام کی بڑی تعداد پہلی مرتبہ حج ادا کر رہی ہوتی ہے، برصغیر پاک و ہند کے حجاج میں بہت سے لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو ساری زندگی حج کی ادائیگی کے لئے رقم جمع کرتے ہیں اور ان کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش ایک نظر اللہ کے گھر کو دیکھ لینا ہی ہوتی ہے، اس کے باوجود یہ دیکھ کر شدید دکھ اور افسوس ہوتا ہے کہ حج کی ادائیگی پر آنے والے حضرات کی اکثریت ارکان حج اور اعمال حج سے لاعلم ہوتی ہے جس کی وجہ سے انہیں دوران حج شدید مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اور کئی افراد صحیح طور پر حج کی ادائیگی سے محروم رہتے ہیں۔

---

[1] فاضل مدینہ یونیورسٹی، چیئرمین المدینہ اسلامک ریسرچ سینٹر کراچی۔

اسی مشاہدہ کو سامنے رکھتے ہوئے "المدینہ اسلامک ریسرچ سینٹر" نے امسال حجاج کرام کی تعلیم و تربیت اور دیار حرم میں قیام میں رہنمائی کے حوالہ سے خصوصی پروگرامز منعقد کئے جن کی تفصیل درج ذیل ہے:

﴿1﴾ حج تربیتی کلاسز:

المدینہ اسلامک ریسرچ سینٹر کے زیر انتظام مسجد سعد بن ابی وقاص ڈیفنس فیز ۴ کراچی میں مؤرخہ ۱۷، ۱۸ ستمبر بروز ہفتہ اور اتوار کو حجاج کرام کو حج و عمرہ کے طریقہ سے تفصیلی طور پر روشناس کرانے کے لئے حج تربیتی کلاس منعقد کی گئی۔ یہ تربیتی کلاس روایتی طریقہ سے بہت مختلف تھی، اس کلاس میں پروجیکٹر (Projector) پر حج و عمرہ کے طریقہ کے حوالہ سے ایک مکمل پریزینٹیشن دکھائی گئی، جو تصاویر، انیمیشن، آڈیو اور ویڈیو کے ذریعہ تیار کی گئی تھی، اس پریزینٹیشن میں مقامات مقدسہ کے نقشہ جات، حرم مکہ، مواقیت کی باتصویر وضاحت، مکہ، منیٰ عرفات کے راستوں اور مقامات کی تفصیل، طواف اور سعی کی تھری ڈی (3D) ویڈیو وغیرہ شامل تھیں۔ یہ پریزینٹیشن پانچ حصوں پر مشتمل تھی:

❶ حج کی تیاری:

- سامان سفر کی پیکنگ کے بارے میں اہم معلومات
- مکہ مدینہ کے موسم کی تفاصیل
- مواقیت احرام اور حرم مکہ کی تفصیلی باتصویر وضاحت۔
- حج کی تینوں اقسام کا بیان۔

❷ عمرہ کا طریقہ:

- احرام کا طریقہ باتصویر۔
- احرام میں منع کردہ امور کی تفصیل۔
- طواف اور سعی کا طریقہ۔
- طواف اور سعی کی (3D) ویڈیوز۔
- مقام ابراہیم، چاہ زمزم کی تفصیل۔

3 حج کا طریقہ:

- منی، مزدلفہ، عرفہ کے نقشہ جات۔
- منی، مزدلفہ، عرفہ میں کئے جانے والے اعمال حج کی تفصیل۔
- حج کے ارکان اور واجبات کا بیان۔
- دوران حج کی جانے والی غلطیاں اور ان کا کفارہ۔
- اعمال حج کا خلاصہ۔

4 مدینہ منورہ کی زیارات: (شرعی و تاریخی)

- مدینہ منورہ کے فضائل۔
- حرم مدینہ کی حدود۔
- مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل و تاریخ۔
- مسجد نبوی میں موجود زیارات۔
- بقیع قبرستان، جبل احد، مسجد قباء۔
- مسجد قبلتین، سبع مساجد، مسجد جمعہ۔
- کنگ فہد پرنٹنگ پریس، وادی جن۔

5 جدید پروجیکٹس:

- حرمین مونوریل۔
- مسجد الحرام کی جدید توسیع۔

﴿2﴾ حج پمفلٹ:

طریقہ حج کے حوالہ سے اردو میں کتابیں تو بہت سی ہیں اور ان کے فوائد بھی ہیں لیکن عموماً یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ حاجی حضرات ان کتابوں کی ضخامت کی وجہ سے ان کا مطالعہ نہیں کرتے ، اسی طرح کتابوں میں بیان کردہ مسائل کی کثرت کی وجہ سے ایک عام آدمی طریقہ حج کو صحیح طرح سمجھ نہیں پاتا،

پھر سفر حج میں ان کتابوں کو ساتھ لے کر چلنا بھی ایک الگ دشواری ہے۔

ان تمام باتوں کو سامنے رکھتے ہوئے المدینہ اسلامک ریسرچ سینٹر نے ایک ایساحج پمفلٹ مرتب کیا جس میں بالکل اختصار اور ترتیب کے ساتھ حج کے مکمل اعمال ذکر کئے گئے، اور کئی اعمال جیسے طواف، سعی، اور رمی جمرات وغیرہ کو رنگین نقشوں کے ساتھ سمجھایا گیاہے۔ یہ چونکہ رنگین پمفلٹ ہے اور آرٹ پیپر پر پرنٹ کیا گیاہے اس لئے یہ پانی، پسینہ وغیرہ سے خراب نہیں ہوتا اور حجاج کرام اسے باآسانی اپنے ساتھ لے جاسکتے ہیں۔ انہی خصوصیات کی وجہ سے یہ پمفلٹ حجاج کرام میں بہت مقبول ہوا، پہلی طباعت چار ہزار کی تعداد میں تھی جو کہ چند دنوں ہی میں ختم ہوگئی اور پھر دوبارہ چار ہزار ہی کی تعداد میں طباعت کرائی گئی اور وہ بھی حج پروازوں کے آخری دنوں تک ختم ہوگئی۔ وللہ الحمد

﴿3﴾ حج کیمپ:

سول ایوی ایشن اتھارٹی نے کراچی سے حج پروازوں کے لئے ائیر پورٹ کے ٹرمینل (3) کو خاص کیاہے، تقریبا تمام حجاج کرام جو پی آئی اے کی پرواز سے جاتے ہیں یہیں سے روانہ ہوتے ہیں، عموماً حجاج کرام پرواز سے کافی پہلے ائیر پورٹ پہنچ جاتے ہیں خصوصاًوہ حجاج جو اندرون سندھ سے حج پر روانہ ہونے کے لئے کراچی آتے ہیں وہ پرواز سے چار پانچ گھنٹہ پہلے ائیر پورٹ پہنچتے ہیں،ائیر پورٹ انتظامیہ کی طرف سے حجاج کے لئے سہولیات کا خاص انتظام نہ ہونے کی وجہ سے حجاج کرام اور ان کے ساتھ آنے والوں کو کافی دشواری اور تکلیف کا سامنا کرنا پڑتاہے، گزشتہ چند سالوں سے کچھ دینی جماعتوں کی جانب سے حج ٹرمینل پر کیمپ لگانے کا سلسلہ جاری ہے، جس میں حاجیوں کے لئے ٹھہرنے کی سہولیات کی ساتھ ساتھ حجاج میں دینی لٹریچر بھی تقسیم کیا جاتاہے، ہزاروں حجاج وہاں سے اپنے ساتھ وہ دینی لٹریچر لے جاتے اور اسی کے مطابق عمل کرتے ، اس دینی لٹریچر میں شرکیات ، بدعات، اور ضعیف و موضوع احادیث کی بھرمار کسی بھی شخص کی گمراہی کے لئے کافی ہے، اس میدان میں جماعت اہلحدیث کی نمائندگی نہ ہونے سے یہ میدان دعوت حق سے خالی تھا۔

اس سال ’’المدینہ اسلامک ریسرچ سینٹر‘‘ نے اس میدان میں جماعت اہلحدیث کی نمائندگی کا بیڑا اٹھایااور الحمدللہ بھرپور طریقہ سے دعوت حق لوگوں تک پہنچائی۔ ابتداءمیں کیمپ لگانے کے حوالہ سے

کچھ دشواریوں کا سامنا رہا لیکن پھر اللہ تعالی کی رحمت سے تمام مشکلات دور ہوتی چلی گئیں اور الحمد للہ المدینہ اسلامک سینٹر اس ذمہ داری سے عمدہ طریقہ سے سرخرو ہوا۔اس سال جو سہولیات کیمپ پر فراہم کی گئیں ان کی تفصیل درج ذیل ہے:

1. آرام کی سہولت:

کیمپ پر حجاج کے لئے ٹینٹ اور کرسیاں فراہم کی گئی تھیں تاکہ فلائٹ سے پہلے آنے کی صورت میں وہ کیمپ پر ٹھہر سکیں، کیمپ پر مرد وخواتین کے لئے الگ الگ ٹینٹ لگائے گئے تھے تاکہ خواتین کے لئے بھی آرام کرنا ممکن ہو۔

2. ورکرز:

حج کیمپ پر تین شفٹوں میں چوبیس گھنٹے چھ سے سات افراد موجود تھے، جن میں سے ایک عالم دین تھے اور باقی ورکرز تھے جو حجاج کی خدمت پر مامور تھے، وہ حجاج کرام کا سامان اپنی ٹرالیوں پر رکھ کر پہلے پارکنگ سے انہیں کیمپ لاتے اور پھر فلائٹ کے ٹائم پر انہیں بورڈنگ لاؤنج تک چھوڑ کر آتے تھے، چونکہ پارکنگ سے بورڈنگ لاؤنج کا فاصلہ کافی تھا اسی لئے حجاج کرام کے لئے یہ سہولت فراہم کی گئی تھی۔

3. حج پیکٹ:

المدینہ اسلامک سینٹر کی جانب سے حج ٹرمینل سے جانے والے حجاج کرام کے لئے حج پیکٹ بھی تقسیم کئے گئے جن میں دعوتی مواد بھی تھا اور حجاج کرام کے لئے کچھ خاص چیزیں بھی، حج پیکٹ میں درج ذیل اشیاء مہیا کی گئی تھیں :

- حصن المسلم۔اردو ترجمہ کے ساتھ
- طریقہ حج وعمرہ اختصار کے ساتھ، مؤلف عمران ایوب لاہوری۔
- حج بروشر۔
- مسواک۔

☆ جوتے رکھنے کے لئے کپڑے کا تھیلا۔ کیونکہ مسجد الحرام اور مسجد نبوی میں جوتے رکھنے کے حوالہ سے حجاج کو بہت مشکل کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اسی لئے حجاج کرام کی سہولت کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ تھیلا فراہم کیا گیا۔

☆ کنکریاں سنبھالنے کے لئے کپڑے کا تھیلا۔

☆ طواف اور سعی کے چکر شمار کرنے کے لئے سات دانوں کی تسبیح۔

یہ پیکٹس اپنی انفرادیت اور عمدگی کی وجہ سے اتنے معروف ہوئے کہ پی آئی اے نے اپنا خصوصی تعاون فراہم کرتے ہوئے اسلام آباد، لاہور، پشاور اور کوئٹہ میں اپنے کاؤنٹر سے انہیں حجاج کرام میں تقسیم کرایا۔

4 تعلیم حج:

حج کیمپ پر حجاج کرام کے لئے تعلیم حج کا بھی خصوصی اہتمام کیا گیا تھا۔ کیمپ پر پروجیکٹر، اسکرین کے ذریعہ مکمل طریقہ حج و عمرہ اور زیارت مدینہ کے آداب کے حوالہ سے خصوصی ویڈیوز اور پریزینٹیشنز دکھائی گئیں، حجاج کرام کی بڑی تعداد نے ان ویڈیوز کو ملاحظہ کیا، اور طریقہ حج کے حوالہ سے اپنی اصلاح کی۔ یہ ویڈیوز حجاج کرام کی آسانی کے لئے موبائل فارمیٹ میں بھی دستیاب تھے جسے حاجی حضرات اپنے موبائل میں ڈاؤن لوڈ کر کے دوران حج بھی رہنمائی حاصل کر سکیں۔

اختتامی کلمات:

یہ تمام خدمات صرف اور صرف اللہ تعالی کی توفیق کا نتیجہ ہیں، اس کے ساتھ ساتھ یہ تمام اعمال بغیر مادی وسائل کے ناممکن ہیں، ان تمام خدمات و اعمال میں جن محسنین نے المدینہ اسلامک ریسرچ سینٹر کے ساتھ شرکت کی یقیناً وہ قابل صد تعریف و جزا ہیں۔

ہم دعا گو ہیں کہ اللہ تعالی انہیں اس کا بہترین صلہ عطا فرمائے اور آئندہ سال زیادہ وسیع پیمانہ پر حجاج کی خدمت اور رہنمائی کے حوالہ سے مساعی خیر کی توفیق عطا فرمائے۔



انشورنس اور تکافل، میزان شریعت میں

عثمان صفدر [1]

تمام تعریفات اللہ رب العالمین کے لئے ہیں جس نے ہمیں عدم سے وجود بخشا، ہمیں بیشمار نعتوں سے نوازا، پاک ہے وہ ذات جس نے اپنی مخلوق کو پیدا کر کے تنہا نہیں چھوڑا، بلکہ ان کے رزق کی ضمانت لی، ان کے لئے رزق کو پہلے سے لکھ دیا، حصول رزق کے اسباب مہیا کئے، اور پوری کائنات کو انسانوں کی خدمت کے لئے مسخر کردیا، اللہ تعالی کا فرمان ہے: ﴿ اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ وَأَنزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجَ بِهِ مِنَ الثَّمَرَاتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۖ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ لِتَجْرِيَ فِي الْبَحْرِ بِأَمْرِهِ ۖ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْأَنْهَارَ ﴿٣٢﴾ وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَائِبَيْنِ ۖ وَسَخَّرَ لَكُمُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ ﴿٣٣﴾ وَآتَاكُم مِّن كُلِّ مَا سَأَلْتُمُوهُ ۚ وَإِن تَعُدُّوا نِعْمَتَ اللَّهِ لَا تُحْصُوهَا ۗ إِنَّ الْإِنسَانَ لَظَلُومٌ كَفَّارٌ ﴿٣٤﴾ ﴾ إبراهيم: 32 - 34

ترجمہ: " اللہ ہی تو ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور آسمان سے مینہ برسایا۔ پھر اس سے تمہارے کھانے کے لئے پھل پیدا کئے۔ اور کشتیوں (اور جہازوں) کو تمہارے زیر فرمان کیا تاکہ دریا (اور سمندر) میں اسکے حکم سے چلیں۔ اور نہروں کو بھی تمہارے زیر فرمان کیا۔ اور سورج اور چاند کو تمہارے لئے کام میں لگا دیا کہ دونوں (دن رات) ایک دستور پر چل رہے ہیں۔ اور رات اور دن کو بھی تمہاری خاطر کام میں لگا دیا۔ اور جو کچھ تم نے مانگا سب میں سے تم کو عنایت کیا۔ اور اگر اللہ کے احسان گننے لگو تو شمار نہ کر سکو۔ (مگر لوگ نعمتوں کا شکر نہیں کرتے) کچھ شک نہیں کہ انسان بڑا بے انصاف اور ناشکرا ہے۔

اور اللہ تعالی کی حکمت کا یہ تقاضہ تھا کہ انسان مختلف آزمائشوں، مصائب، خطرات اور پریشانیوں میں مبتلا ہو،

[1] فاضل مدینہ یونیورسٹی، چیئرمین المدینہ اسلامک ریسرچ سینٹر کراچی۔

اسی لئے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:﴿ وَلَنَبْلُوَنَّكُم بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنفُسِ وَالثَّمَرَاتِ ۗ وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ ﴿١٥٥﴾ ﴾ البقرۃ: 155

ترجمہ: "اور ہم کسی قدر خوف اور بھوک اور مال اور جانوں اور میووں کے نقصان سے تمہاری آزمائش کریں گے تو صبر کرنے والوں کو (اللہ کی خوشنودی کی) بشارت سنادو"۔

اسی لئے شریعت اسلامی میں اللہ تعالی نے بچاؤ کے اسباب بیان فرمائے ہیں، تحفظ اور امن وامان کے راستے ذکر کئے ہیں، کلام الہیٰ کی تلاوت کرنے والا جانتا ہے کہ کس طرح رب العالمین نے انسانوں کی امن وامان اور عدل وانصاف کی طرف رہنمائی فرمائی ہے، اور اسی طرح رحمت دوعالم ﷺ نے اپنی امت کو جان ومال کے تحفظ اور معاشرہ میں امن وامان قائم کرنے کے اسباب ووسائل بیان فرمائے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ جان ومال کا تحفظ ان پانچ بنیادی ضروریات میں سے ہے جس کے حصول تحفظ کے لئے شریعت اسلامی کا نزول ہوا ہے۔ اور امن وامان ایسی نعمت ہے جسے اللہ تعالی نے قریش مکہ پر کی جانے والی بڑی نعمتوں میں سے ایک قرار دیا ہے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا آمِنًا وَيُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ ۚ أَفَبِالْبَاطِلِ يُؤْمِنُونَ وَبِنِعْمَةِ اللَّهِ يَكْفُرُونَ ﴿٦٧﴾ ﴾ العنکبوت: 67

ترجمہ: "کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ ہم نے حرم کو مقام امن بنایا ہے اور لوگ اس کے گرد ونواح سے اچک لئے جاتے ہیں کیا یہ لوگ باطل پر اعتقاد رکھتے ہیں اور اللہ کی نعمتوں کی ناشکری کرتے ہیں"۔

اسی طرح فرمایا:﴿ لِإِيلَافِ قُرَيْشٍ ﴿١﴾ إِيلَافِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَاءِ وَالصَّيْفِ ﴿٢﴾ فَلْيَعْبُدُوا رَبَّ هَٰذَا الْبَيْتِ ﴿٣﴾ الَّذِي أَطْعَمَهُم مِّن جُوعٍ وَآمَنَهُم مِّنْ خَوْفٍ ﴿٤﴾ ﴾ القریش

ترجمہ: "قریش کے مانوس کرنے کے سبب۔ یعنی ان کو جاڑے اور گرمی کے سفر سے مانوس کرنے کے سبب۔ لوگوں کو چاہئے کہ (اس نعمت کے شکر میں) اس گھر کے مالک کی عبادت کریں۔ جس نے ان کو بھوک میں کھانا کھلایا اور خوف سے امن بخشا"۔

یقیناً امن وامان اللہ تعالی کی بہت بڑی نعمت ہے نبی کریم ﷺ کا فرمان ہے: جس شخص نے اس حالت میں صبح کی کہ وہ خوش حال تھا بدن کے لحاظ سے تندرست تھا اور اس کے پاس اس دن کے لئے روزی

موجود تھی تو گویا کہ اس کے لئے دنیا سمیٹ دی گئی"۔[1]

شریعت اسلامی میں امن و امان کو شرک سے پاک ایمان اور عمل صالح کے ساتھ مشروط قرار دیا گیا ہے ، یعنی ایمان اور عمل صالح ہی معاشرہ میں امن وامان اور جان ومال کے تحفظ کی ضمانت (insurance) ہیں نہ کہ غیر اسلامی اقتصادی و معاشرتی پالیسیاں ۔ اللہ تعالی کا قرآن مجید میں واضح فرمان ہے:﴿ ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ وَلَمۡ يَلۡبِسُوٓاْ إِيمَٰنَهُم بِظُلۡمٍ أُوْلَٰٓئِكَ لَهُمُ ٱلۡأَمۡنُ وَهُم مُّهۡتَدُونَ ﴾الأنعام

ترجمہ: "جو لوگ ایمان لائے اور اپنے ایمان کو (شرک کے) ظلم سے مخلوط نہیں کیا ان کے لئے امن (اور جمعیت خاطر) ہے۔ اور وہی ہدایت پانے والے ہیں۔

ایک اور مقام پر اللہ تعالی کا فرمان ہے: ﴿ وَعَدَ ٱللَّهُ ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ مِنكُمۡ وَعَمِلُواْ ٱلصَّٰلِحَٰتِ لَيَسۡتَخۡلِفَنَّهُمۡ فِي ٱلۡأَرۡضِ كَمَا ٱسۡتَخۡلَفَ ٱلَّذِينَ مِن قَبۡلِهِمۡ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمۡ دِينَهُمُ ٱلَّذِي ٱرۡتَضَىٰ لَهُمۡ وَلَيُبَدِّلَنَّهُم مِّنۢ بَعۡدِ خَوۡفِهِمۡ أَمۡنٗاۚ يَعۡبُدُونَنِي لَا يُشۡرِكُونَ بِي شَيۡـٔٗاۚ وَمَن كَفَرَ بَعۡدَ ذَٰلِكَ فَأُوْلَٰٓئِكَ هُمُ ٱلۡفَٰسِقُونَ ﴿٥٥﴾ ﴾ النور: 55

ترجمہ: " جو لوگ تم میں سے ایمان لائے اور نیک کام کرتے رہے ان سے اللہ کا وعدہ ہے کہ ان کو ملک کا حاکم بنادے گا جیسا ان سے پہلے لوگوں کو حاکم بنایا تھا اور ان کے دین کو جسے اس نے ان کے لئے پسند کیا ہے مستحکم وپائیدار کرے گا اور خوف کے بعد ان کو امن بخشے گا وہ میری عبادت کریں گے (اور) میرے ساتھ کسی اور کو شریک نہ بنائیں گے اور جو اس کے بعد کفر کرے تو ایسے لوگ بد کردار ہیں"۔

عہد نبوت سے لے کر تقریباً نو سو سال تک عالمی تجارت پر اسلامی اصول تجارت کا رنگ غالب رہا، اور چونکہ اسلامی معیشت کے قواعد وضوابط خالق کائنات کے مقرر کردہ تھے اس لئے وہ حقیقت پر مبنی معیشت تھی جس میں حیلہ بہانے نہیں تھے، جس کی بنیادوں میں اخلاق اور ایک دوسرے سے تعاون کا جذبہ تھا نہ کہ لوٹ کھسوٹ اور زیادہ سے زیادہ نفع کمانے کی حرص، اسی لئے اس دور میں مصنوعی کساد بازاری، بیروزگاری کا شائبہ تک نہ تھا، مال چند ہاتھوں کی زینت نہیں تھا، غریب اور مالدار میں زیادہ حد بندی نہیں تھی، جان ومال کے تحفظ کی ضمانت نہیں دینی پڑتی تھی، لیکن مسلمانوں کی اسلامی تعلیمات

[1] ترمذی کتاب الزهد ح 2268

سے دوری اور مغربیت پرستی نے عالمی تجارت سے اسلامی روح کو ختم کر دیا اور پوری عالمی تجارت چند صیہونیت زدہ ذہنوں کے ہاتھوں یرغمال ہو گئی جنہوں نے پوری دنیا میں سود اور دھوکہ بازی کا بازار گرم کر کے امیر کو امیر تر اور غریب کو غریب تر بنانے کی پوری کوشش کی، اور سود کی صورت میں حاصل ہونے والے بے پناہ منافع کو اپنے اسلام مخالف مذموم مقاصد میں استعمال کیا۔ اسی وجہ سے تجارتی میدان میں ایسے مسائل پیدا ہونا شروع ہوئے جن کا ذکر قدیم فقہاء کی کتابوں میں نہیں ملتا ہے، انہی مسائل میں سے ایک مسئلہ "انشورنس" یعنی بیمہ پالیسی کا بھی ہے۔

انشورنس کے معاملہ میں بنیادی تصور یہ کارفرما ہے کہ ایک شخص کسی معاشرہ میں رہ کر تجارت کرنا چاہے، کوئی کام کرنا چاہے لیکن اسے اپنی جان ومال کے تحفظ کے حوالہ سے خطرات لاحق ہوں یا تجارت میں خسارہ کا اندیشہ ہو تو کوئی دوسرا شخص آکر اسے جان ومال کے تحفظ، اور تجارت میں خسارہ نہ ہونے کی ضمانت دے، اور کسی قسم کے نقصان کی صورت میں ایک مخصوص رقم ادا کرے، اور اس ضمانت دینے کے بدلہ معاوضہ طلب کرے۔

جیسا کہ ذکر ہوا کہ انشورنس جدید مسائل میں سے ہے اس لئے متقدمین کی کتابوں میں اس مسئلہ کا حکم مذکور نہیں، غالباً سب سے پہلے جس عالم نے اسے اس کی ابتدائی شکل میں تحریر کیا ہے وہ علامہ ابن عابدین ہیں جنھوں نے اپنی کتاب "حاشیہ رد المختار" میں ایک مسئلہ ذکر کیا جو کہ انشورنس سے مطابقت رکھتا ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ان کے دور میں تجار ایک معاہدہ کرتے تھے جسے "سوکرہ" کہا جاتا تھا، وہ یہ ہے کہ جب مسلمان تجار دیار کفر سے دیار اسلام کی طرف واپس ہوتے تو ایک کافر سے کشتی کرائے پر لیتے اسے کرایہ ادا کرتے اور مزید رقم بھی دیتے اور اس سے یہ معاہدہ کرتے کہ اگر راستہ میں ان کا مال غرق ہو گیا یا ضائع ہو گیا، یا چوری ہو گیا تو وہ انہیں ان کے مال کے بقدر قیمت ادا کرے گا، اس کافر کا ایک وکیل دیار اسلام میں ہوتا تھا جو نقصان کی صورت میں مسلمانوں کو رقم کی ادائیگی کرتا تھا۔ اس معاہدہ کے بارے میں علامہ ابن عابدین فرماتے ہیں: "یہ معاہدہ جائز نہیں، کیونکہ اس میں ایسی چیز اپنے لئے لازم کر لی گئی ہے جس کا وہ ذمہ دار نہیں ہے"۔ [1]

---

[1] حاشية رد المختار (3\ 249)

بالکل یہی معاملہ انشورنس کا بھی ہے، پہلے ہم انشورنس کی تعریف سمجھ لیں تاکہ اس کا حکم سمجھنے میں آسانی ہو۔

انشورنس:

اس کی کئی اقسام ہیں لیکن جو قسم معروف ہے اور انشورنس کمپنیوں کے ذریعہ جو انشورنس کیا جاتا ہے اسے تجارتی بیمہ پالیسی(commercial insurance) کہتے ہیں، اس کی تعریف کچھ یوں کی جاتی ہے:

"ایسا معاہدہ (agreement) جو لین دین (تجارتی) پر مشتمل ہو، اس میں ایک طرف صارف (costumer) ہے جو کہ اقساط(installment) ادا کرتا ہے اور دوسری طرف کوئی ایک شخص یا کوئی کمپنی ہو سکتی ہے، اس معاہدہ میں یہ طے کیا جائے کہ صارف ایک مقررہ مدت تک کچھ خاص رقم قسط کی صورت میں یا ایک ہی دفعہ میں اس کمپنی کو ادا کرے گا، اس کے بدلہ میں کمپنی اس صارف کو اسی مقررہ مدت میں کچھ خاص چیزوں کے بارے میں ضمانت(insurance) دیتی ہے(مثلاً اس کی زندگی، یا گاڑی، یا کاروبار وغیرہ) کہ اگر اس میں صارف کو کسی قسم کا نقصان اٹھانا پڑا تو یہ کمپنی اس نقصان کی ادائیگی کرے گی، اور ادائیگی کی رقم پہلے سے طے کر لی جاتی ہے، قسطیں ادا نہ کر سکنے کی صورت میں معاہدہ ختم ہو جاتا ہے، اسی طرح مقررہ مدت میں کسی قسم کا حادثہ (جو معاہدہ میں طے شدہ ہو) نہ ہونے کی صورت میں مدت ختم ہونے کے بعد مکمل رقم یا کچھ رقم کمپنی رکھ لیتی ہے "۔

یہ انشورنس کی بنیادی تعریف ہے، تمام تجارتی انشورنس کمپنیوں میں کم و بیش یہی صورت ہوتی ہے، البتہ معاہدہ کی دیگر شروط(Terms & conditions) میں فرق ہو سکتا ہے۔

کچھ معاہدوں میں مدت طے نہیں کی جاتی، بلکہ انشورنس کمپنیاں مدت طے کرنے کے بجائے حادثہ کا وقت طے کر لیتی ہیں، یعنی اگر زندگی کی انشورنس ہے تو صارف کی موت تک یہ معاہدہ چلتا رہتا ہے، اگر گاڑی کی انشورنس ہے تو اس گاڑی کے حادثہ ہو جانے تک، اسی طرح کاروبار وغیرہ میں۔

اب اس تعریف کو نکات(points) کی صورت میں رکھتے ہیں:

1. یہ معاہدہ (agreement) تجارتی (commercial) ہے تعاونی (cooperation) نہیں ہے۔
2. یہ معاہدہ دونوں طرف سے ہے، صارف قسط (Installment) جمع کراتا ہے، اور کمپنی اس

کا نقصان ادا کرتی ہے۔

3 مدت طے نہ ہونے کی صورت میں اس معاہدہ میں احتمال (Probability) آجاتا ہے، کہ نہ جانے یہ معاہدہ کب مکمل ہو۔

کمرشل انشورنس کا حکم:

کمرشل انشورنس چاہے کوئی سی بھی ہو یعنی life insurance , goods insurance , third party insurance وہ حرام ہے، اس کی حرمت کا فتوی سعودی عرب کی علماء کمیٹی اور اسی طرح مجمع الفقہ الاسلامی (Islamic Fiqh Academy) نے بھی دیا ہے۔

انشورنس کے حرام ہونے کی کئی وجوہات ہیں جن میں سے چند اہم اسباب درج ذیل ہیں:

1 پہلا سبب:

اس میں دھوکہ اور لاعلمی ہے، جسے عربی میں "غرر" کہتے ہیں، اور اس قسم کے معاہدہ سے نبی ﷺ نے منع فرمایا ہے۔[1]

اس میں دھوکہ اس طرح ہے کہ:

☆ جس نقصان کی ادائیگی طے کی گئی ہے اس کا ہونے یا نہ ہونے میں احتمال ہے، وہ نقصان یا حادثہ ہو بھی سکتا ہے اور نہیں بھی ہو سکتا۔

☆ اس میں دھوکہ اس وقت زیادہ ہو جاتا ہے جب ایک مدت مقرر کرنے کے بجائے اس معاہدہ کی تکمیل حادثہ ہو جانے تک رکھی جائے۔

☆ اور یہ دھوکہ اس وقت مزید بڑھ جاتا ہے جب ایک مدت مقرر کر لی جائے کہ اس مدت تک صارف اقساط ادا کرتا رہے گا، اگر اس مدت کے اندر حادثہ ہو گیا تو کمپنی اس کا نقصان پورا کرے گی، اگر نہیں ہوا اور مدت ختم ہو گئی تو صارف کی ادا کردہ رقم کمپنی اس کو واپس نہیں کرتی، جیسا کہ اکثر goods insurance میں ہوتا ہے۔

---

[1] صحیح مسلم ، 1513

☆ اسی طرح اس معاہدہ میں صارف کو یہ معلوم نہیں کہ وہ کتنی رقم ادا کرے گا؟ کب تک ادا کرے گا؟ اگر یہ معلوم ہو بھی جائے تب بھی نقصان کا ہمیں علم نہیں ہے کہ وہ ہو گا بھی کہ نہیں؟۔

2 دوسرا سبب:

اس میں جوا (Gambling) ہے۔ جوا کی تعریف علماء یوں کرتے ہیں کہ "ایسا معاہدہ جس میں دو یا دو سے زائد شریک ہوں، ایک کو نفع ہو باقی نقصان میں رہیں اور کسی کے علم میں نہ ہو کہ کون نقصان میں رہے گا اور کون نفع میں"، اگر جوا کھیل کے میدان میں ہو تو اسے قمار کہتے ہیں، اگر تجارت میں ہو تو اسے " میسر" کہتے ہیں۔ اور جوا بالاتفاق حرام ہے، اس سے اللہ تعالی نے اور نبی ﷺ نے سختی سے منع فرمایا ہے۔

اللہ تعالی کا فرمان ہے: ﴿يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓاْ إِنَّمَا ٱلْخَمْرُ وَٱلْمَيْسِرُ وَٱلْأَنصَابُ وَٱلْأَزْلَـٰمُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ ٱلشَّيْطَـٰنِ فَٱجْتَنِبُوهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴿٩٠﴾﴾ [1]

ترجمہ: "اے ایمان والو! شراب اور جُوا اور بت اور پاسے (یہ سب) ناپاک کام اعمال شیطان سے ہیں۔ سو ان سے بچتے رہنا تاکہ نجات پاؤ"۔

اور نبی ﷺ کا فرمان ہے: " بیشک اللہ تعالی نے شراب اور جوا کو حرام قرار دیا ہے"۔ [2]

اس معاہدہ میں جوا اس طرح ہے کہ:

☆ اس معاہدہ کے دو شریک ہیں، دونوں میں سے ایک کو نفع ہو گا دوسرے کو نقصان۔

☆ صارف کو نفع اس طرح ہو گا کہ اگر معاہدہ ہوتے ہی صارف کا نقصان ہو گیا تو اس نے کمپنی کو اتنی رقم ادا نہیں کی ہو گی جتنی اس کو حاصل ہو گی، اور اس میں کمپنی کو نقصان ہے۔

☆ کمپنی کو فائدہ اس طرح ہو گا کہ اگر مدت پوری ہو جائے اور حادثہ نہ ہوا تو صارف کی ادا کی گئی رقم ضائع ہو جائے گی، اور ساری رقم کمپنی کو مل جائے گی جبکہ صارف کے ہاتھ کچھ نہیں آئے گا۔ اور یہی معاملہ جوئے میں ہوتا ہے کہ دو طرف سے رقم لگائی جاتی ہے ایک کو نفع ہوتا ہے اور

---

[1] المائدة 90

[2] سنن البيهقي (10\ 213)

دوسرے کو نقصان ہوتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر اس معاہدہ کو بغور دیکھا جائے تو یہ انشورنس کے بجائے ایک طرح کی شرط (Bet) ہے، کمپنی شرط لگاتی ہے کہ صارف کا نقصان نہیں ہو گا اور اگر نقصان ہوا تو کمپنی شرط ہارنے کی وجہ سے رقم ادا کرتی ہے، اور صارف کے اس معاہدہ میں کردار سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس نے اپنے نقصان کے ہونے کی شرط لگائی تھی اور شرط ہارنے کی صورت میں وہ اپنی رقم سے ہاتھ دھو بیٹھا۔

3 تیسرا سبب:

اس میں سود شامل ہے، بلکہ یہ سارا معاہدہ سود (interest) پر مشتمل ہے۔ سود کی بنیادی طور پر دو اقسام ہیں: (۱) قرض کا سود۔ (۲) تجارت کا سود۔

(1) قرض کا سود یہ ہے کہ ایک شخص کسی کو ادھار دے کر زیادہ طلب کرے۔

(2) تجارت کا سود: اس کی پھر دو اقسام ہیں:

(ا) زیادتی کا سود (ربا الفضل) (۲) ادھار کا سود (ربا النسیئۃ)

(ا) زیادتی کا سود یہ ہے کہ وہ مخصوص اجناس جنہیں شرعی اصطلاح میں "سودی اجناس" کہتے ہیں میں سے ایک ہی جنس کا تبادلہ کرتے وقت اضافہ کر دینا، جیسے مثال کے طور پر:

پانچ تولہ سونا (سکہ کی صورت میں) = چار تولہ سونے کا سیٹ۔

(ب) ادھار کا سود: سودی اجناس کا آپس میں تبادلہ کرتے وقت ادھار کر لینا، جیسے مثال کے طور پر:

ایک من گندم = ایک من چاول ایک مہینہ بعد۔

انشورنس میں تینوں اقسام کا سود موجود ہے وہ اس طرح کہ:

- ✫ جو پیسہ صارف، کمپنی کو ادا کرتا ہے وہ یا تو کمپنی پر قرض ہے یا پھر کمپنی صارف سے پیسوں کے بدلہ پیسہ کا تبادلہ کر رہی ہے جو کہ فوراً ادا نہیں کیا جائے گا بلکہ بعد میں طے شدہ موقع پر اسے اس پیسہ کی ادائیگی کرے گی۔
- ✫ اگر وہ پیسہ قرض ہے تو اس کے بدلہ زیادہ طلب کرنا سود ہے۔
- ✫ اگر وہ تجارت ہے تو اس میں پیسوں کا تبادلہ ہے، اور ایک ہی جنس کا تبادلہ کرتے وقت اضافہ

کرنا بھی سود ہے، اسی طرح اس تبادلہ میں جو ایک عرصہ کے بعد ادائیگی کی جاتی ہے وہ ادھار کا سود ہو گا۔

خلاصہ کلام: یہ کہ انشورنس کا معاملہ سود پر مبنی ہے، صارف پیسہ ادا کرتا ہے اور اس کے بدلہ اسے پیسہ ہی ملتا ہے، اور یہ پیسہ اسے یا تو زیادہ ملتا ہے (حادثہ یا خسارہ کی صورت میں) یا کم ملتا ہے (حادثہ یا خسارہ نہ ہونے کی صورت میں) اور اگر جتنا ادا کیا ہے اتنا ہی ملے تو بھی وہ ایک مدت کے بعد ہے، تو اگر پیسوں کا تبادلہ (exchange) ہو تو اس میں بالکل برابر برابر ہونا چاہیئے، کمی یا زیادتی نہیں ہونی چاہیئے؛ کیونکہ کمی یا زیادتی ہی سود کہلاتی ہے، اور ادھار بھی نہیں ہونا چاہیئے، کیونکہ نبی ﷺ کا فرمان ہے: "سونے کو سونے کے بدلہ، چاندی کو چاندی کے بدلہ جب بیچو تو نقد ہو ادھار نہ ہو اور برابر برابر ہو، کمی یا زیادتی نہ ہو"۔ [1]

اور پیسہ کا حکم وہی ہے جو سونے کا حکم ہے، کیونکہ پیسہ سونے کا alternative ہے۔

ان تمام دلائل سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ انشورنس ایک قطعی غیر شرعی معاملہ ہے اور اس کی بنیاد سود، جوا، اور دھوکہ پر رکھی گئی ہے لہذا یہ معاہدہ کرنا حرام ہے۔

انشورنس کے حوالہ سے چند شبہات اور ان کا ازالہ:

انشورنس کو حلال اور جائز کہنے والے افراد چند کمزور دلائل کا سہارا لیتے ہیں جو کہ شبہات سے زیادہ کا درجہ نہیں رکھتے، ہم ان شبہات میں سے نسبتاً قوت رکھنے والے چند شبہات کا جائزہ لیتے ہیں:

1. "**انشورنس کا معاہدہ، مضاربہ کی طرح ہے،** انشورنس کمپنی، صارف کے پیسوں کو کاروبار میں لگاتی ہے، اور جب صارف کو کوئی حادثہ یا نقصان ہوتا ہے تو اس کاروبار سے ہونے والے منافع سے اس کا نقصان پورا کیا جاتا ہے"۔

اس کا جواب یہ ہے کہ مضاربہ ایک اسلامی معاہدہ ہے اور انشورنس اور مضاربہ میں کسی قسم کی مماثلت نہیں، بلکہ دونوں معاملوں میں کئی فرق ہیں، مثلاً:

- مضاربہ میں مال دینے والے شخص کا مال بدستور اس کی ملکیت میں رہتا ہے جبکہ انشورنس میں قسطیں ادا کرنے والے کا مال اس کی ملکیت سے نکل کر کمپنی کی ملکیت میں چلا جاتا ہے اور اس مال

[1] صحیح مسلم (1586)

پر صارف کا کوئی حق نہیں ہوتا۔

☆ مضاربہ میں جو منافع ہوتا ہے وہ مال دینے والے اور کام کرنے والے دونوں کے درمیان تقسیم ہوتا ہے، جبکہ انشورنس میں مال کے ذریعہ جو منافع ہوتا ہے وہ صرف کمپنی کا ہوتا ہے، اور صارف کو اس میں سے اسی وقت مخصوص ادائیگی کی جاتی ہے جب اس کو کسی قسم کا نقصان پہنچے، اور اگر نقصان نہ ہو تو اسے کسی قسم کا منافع ادا نہیں کیا جاتا۔

2 **"انشورنس جدید دور کا مسئلہ ہے، اور شریعت کا قاعدہ ہے کہ تجارتی معاملات میں اصل یہ ہے کہ وہ مباح ہیں جائز ہیں،** لہذا شریعت کے اس قانون کے تحت انشورنس کا معاملہ بھی جائز ہے"۔

اس کا جواب یہ ہے کہ شریعت کایقیناً یہی قاعدہ ہے کہ تجارتی معاملات میں اصل یہ ہے کہ وہ مباح ہیں لیکن مکمل قاعدہ یہ ہے کہ وہ اس وقت تک مباح ہیں جب تک ان کی تحریم ثابت نہ ہو جائے، اگر شریعت کے کسی قاعدہ کے تحت وہ حرام ہوں تو انہیں حرام ہی کہا جائے گا، اور انشورنس کی حرمت کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ وہ سود پر مبنی ہے۔

3 **"انشورنس کا نظام شریعت میں عاقلہ کے نظام کی طرح ہے"۔**

"عاقلہ" کا نظام یہ ہے کہ جب کسی شخص سے قتل خطا واقع ہو جائے، یعنی غلطی سے کسی شخص کو قتل کر بیٹھے تو اس کی دیت اس پر واجب ہو جاتی ہے، اگر وہ شخص تنہا اس دیت کو ادا کرنے پر قادر نہ ہو تو اس کے والد کی طرف سے جو رشتہ دار ہیں جنہیں عربی میں عاقلہ کہا جاتا ہے جیسے دادا، چاچا، بھائی وغیرہ وہ اس دیت کی ادائیگی میں اس کے شریک بنتے ہیں۔

نظام عاقلہ کسی بھی جہت سے انشورنس سے مطابقت نہیں رکھتا کیونکہ نظام عاقلہ قطعی طور پر تعاون پر مبنی نظام ہے جس میں کسی قسم کے عوض اور بدل کا مطالبہ نہیں کیا جاتا، جبکہ انشورنس کے نظام میں انشورنس کمپنی اگر صارف کے نقصان کو پورا کرتی ہے، تو اس کے عوض کا بھی مطالبہ کرتی ہے اور بغیر عوض اور پیسہ کے کوئی کمپنی کسی شخص کا انشورنس نہیں کرتی۔

4 **انشورنس کا معاملہ Provident Fund کی طرح ہے،** جس طرح ایک کمپنی اپنے ورکرز کی تنخواہوں میں سے ایک مخصوص حصہ نکال کر اس فنڈ میں جمع کرتی ہے اور ریٹائرمنٹ پر انہیں

مزید پیسے شامل کر کے ادا کرتی ہے، اسی طرح انشورنس کمپنی اپنے صارف سے ماہانہ قسط لے کر جمع کرتی ہے اور حادثہ یا نقصان کے وقت اسے مزید پیسے شامل کر کے ادا کرتی ہے، اگر پروو ڈنٹ فنڈ لینا جائز ہے تو انشورنس بھی حلال ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ انشورنس اور Provident Fund میں کئی بنیادی فرق ہیں، جیسے:

- ☆ پروو ڈنٹ فنڈ کمپنی کی طرف سے اپنے ملازمین کے لئے ایک قسم کا تعاون ہے، جو وہ اپنے ملازمین کی خدمات کے صلہ میں ادا کرتی ہے اور اس کے بدلہ کسی قسم کے عوض کا مطالبہ نہیں کرتی، لہذا اس میں کسی کے نفع یا نقصان میں رہنے کا اندیشہ نہیں ہوتا اور نہ ہی اس میں سود آتا ہے، جبکہ انشورنس مکمل طور پر ایک تجارتی معاہدہ ہے جس میں انشورنس کمپنی اپنی انشورنس کے بدلہ معاوضہ کا مطالبہ کرتی ہے اسی وجہ سے اس میں جوا اور سود دونوں ہی شامل ہیں۔
- ☆ پروو ڈنٹ فنڈ میں ملازم کو رقم ملنا حتمی اور یقینی ہے، چاہے وہ ریٹائرمنٹ کی صورت میں ملازم کو ملے یا موت کی صورت میں اس کے ورثاء کو ملے، جبکہ انشورنس میں رقم کا حصول یقینی نہیں ہوتا، اگر نقصان ہو گیا تو رقم مل جائے گی ورنہ صارف خالی ہاتھ رہے گا۔
- ☆ پروو ڈنٹ فنڈ میں ادائیگی کی رقم پہلے سے طے نہیں ہوتی، بلکہ جتنی رقم ملازم کی جمع ہو چکی ہوتی ہے اس میں کمپنی ایک خاص تناسب سے اپنا حصہ ڈال کر ملازم کو ادائیگی کر دیتی ہے، جبکہ انشورنس میں ادائیگی کی رقم پہلے سے طے کر لی جاتی ہے چاہے اس کے بقدر صارف نے رقم جمع کرائی ہو یا نہیں۔

ان تمام باتوں کو سامنے رکھتے ہوئے یہ فیصلہ کرنا مشکل نہیں کہ انشورنس اور پروو ڈنٹ فنڈ میں کسی قسم کی مماثلت نہیں۔

5. ایک اہم ترین شبہ جسے شیخ عبد اللہ بن احمد بن منیع نے ذکر کیا ہے جو کہ سعودی عرب کی علماء کمیٹی کے ممبر ہیں اور انشورنس کے جواز کے قائل ہیں، اور خود بھی ایک انشورنس کمپنی کے شرعی ایڈوائزر ہیں، وہ کہتے ہیں کہ انشورنس کمپنی اور صارف کا تعلق قرض لینے اور دینے والے کا نہیں ہے اور نہ ہی اس معاملہ میں پیسوں کا تبادلہ ہے، بلکہ دراصل انشورنس کمپنی اپنے صارف کو پیسوں کے بدلہ امن کی ضمانت فروخت کرتی ہے، یعنی اگر گاڑی کا انشورنس ہے تو گاڑی کا حادثہ سے امن میں

رہنے کی ضمانت، اسی طرح کسی اور سامان کا انشورنس ہو تو اس کا کسی نقصان یا حادثہ سے امن میں رہنے کی ضمانت۔ان کا کہنا ہے کہ اگرچہ ضمانت ایک معنوی چیز ہے مادی نہیں لیکن معنوی چیزیں بھی فروخت ہوتی ہیں اور ان کی مارکیٹ ویلیو ہوتی ہے جیسے کسی کمپنی کا نام، اس کا لوگو، کسی کتاب کی طباعت کے حقوق وغیرہ فروخت کیئے جاتے ہیں حالانکہ یہ سب معنوی اشیاء ہیں مادی نہیں ہیں۔

اس ضمانت کی وجہ سے صارف مطمئن رہتا ہے کہ میری چیز کو نقصان نہیں ہو گا، اگر ہوا تو بھی اطمئنان ہے کہ انشورنس کمپنی اس نقصان کو پورا کریگی۔

اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ:

- یہاں تک تو بات ٹھیک ہے کہ ضمانت ایک معنوی چیز ہونے کے باوجود اسے فروخت کیا جا سکتا ہے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا انشورنس کمپنی واقعی ضمانت ہی فروخت کرتی ہے؟۔ حقیقت یہ ہے کہ انشورنس کے معاہدہ میں کمپنی حادثہ سے امن کی ضمانت نہیں دیتی کہ صارف کی چیز کو حادثہ یا نقصان نہیں ہو گا، بلکہ حادثہ کی صورت میں تلافی کی ضمانت دیتی ہے یعنی اس بات کی ضمانت دیتی ہے کہ اگر صارف کی انشورنس کردہ چیز کو نقصان ہوا تو کمپنی اس کے لئے مخصوص رقم ادا کرے گی، اور اگر نقصان نہ ہوا تو صارف خالی ہاتھ ہی رہے گا اور کمپنی اس کی ادا کردہ رقم اسے نہیں لوٹائے گی، لہذا اس میں پیسوں کا ہی تبادلہ ہے اور یہ صورت بالکل شرط (Bet) لگانے کی طرح ہے۔
- شریعت کا اصول ہے کہ کوئی چیز فروخت کرنے کے لئے ضروری ہے کہ وہ بیچنے والے کی ملکیت ہو اور اس کے پاس موجود ہو، یا پھر اگر وہ چیز اس کی ملکیت میں نہ ہو تو بیچنے والا کم از کم اس کے حصول کی طاقت رکھتا ہو تا کہ اسے حاصل کر کے خریدار کے سپرد کر سکے، نبی ﷺ کا فرمان ہے: ”جو چیز تمہارے پاس نہیں اسے مت بیچو“[1]۔

اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ انشورنس کمپنی پیسوں کے بدلہ چیز کی ضمانت فروخت کرتی ہے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انشورنس کمپنی والے کیسے کسی چیز کی ضمانت فروخت کر سکتے ہیں جبکہ وہ اس ضمانت کے

[1] سنن ترمذی (1232)

مالک ہی نہیں ہیں، نہ ہی اس کے حصول کی استطاعت رکھتے ہیں نہ کوشش کرتے ہیں ؟، کسی چیز کے درست رہنے کی ضمانت تو اس چیز کو بنانے والی کمپنی ہی دیتی ہے، یا پھر حکومت جو کہ معاشرہ میں امن قائم رکھنے کی ذمہ دار ہے وہ ہی ضمانت دے سکتی ہے، انشورنس کمپنی والے تو اپنے دفتر میں بیٹھ کر رقوم کا لین دین کرتے ہیں، وہ اپنی انشورنس کردہ کسی چیز کی حفاظت کا نہ تو انتظام کرتے ہیں نہ ہی معاشرہ میں قیام امن کے لئے کوئی جدوجہد ؟؟۔

- اگر ہم یہ بات بھی تسلیم کرلیں کہ انشورنس کمپنی اشیاء کی ضمانت ہی فرخت کرتی ہے اور وہ اس ضمانت کی مالک بھی ہے تو پھر ایک اور سوال ذہن میں آتا ہے کہ نقصان یا حادثہ کی صورت میں کمپنی جو رقم ادا کرتی ہے اس کی کیا حیثیت ہے ؟ کیا صارف نے ضمانت کے ساتھ اس رقم کو بھی خرید لیا ہے یا پھر ضمانت دینے کے باوجود نقصان ہونے کی وجہ سے انشورنس کمپنی وہ رقم بطور عوض کے ادا کرتی ہے۔ اگر ہم یہ کہیں کہ صارف نے اس رقم کو خریدا نہیں ہے بلکہ کمپنی صارف کا نقصان ہونے کی وجہ سے ادا کرتی ہے تو پھر وہ رقم اتنی ہی ہونی چاہئے جتنا نقصان ہوا ہے، پہلے سے ہی طے شدہ رقم کیوں ادا کی جاتی ہے ؟ اور اگر ہم یہ کہیں کہ صارف نے ضمانت کے ساتھ ساتھ وہ رقم بھی خریدی ہے تو بات وہیں آجاتی ہے کہ اس میں رقوم کا تبادلہ ہے جس میں اضافہ کرنا سود کے زمرے میں آتا ہے، اور اس کے ساتھ ساتھ یہ مسئلہ الگ ہے کہ اگر صارف نے وہ رقم بھی خریدی ہے تو ہر صارف کو اس کی ادائیگی کیوں نہیں کی جاتی، صرف نقصان ہو جانے پر ہی کیوں ادائیگی کی جاتی ہے ؟۔

ان تمام دلائل سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ انشورنس میں ضمانت نہیں فروخت کی جاتی بلکہ رقوم کا تبادلہ ہوتا ہے، جس میں ایک فریق نفع میں اور دوسرا نقصان میں رہتا ہے۔

تکافل:

اللہ تعالی کی توفیق سے تین چار دہائیاں قبل سے عالم اسلام میں بیداری کی ایک لہر پیدا ہوئی ہے اور مسلمانوں نے اپنے معاملات پر نظر ثانی شروع کی ہے، اس بیداری کے نتیجہ میں جہاں مسلمانوں نے اور میدانوں میں پیش قدمی کی ہے وہیں میدان تجارت میں بھی اسلامی اصول تجارت کو دوبارہ زندہ کرنے

کی قابل قدر اور قابل تعریف کاوشیں ہوئی ہیں، اور ان کوششوں میں بحمد اللہ مزید اضافہ دیکھنے میں آرہا ہے، اس تحریک کے نتیجہ میں جہاں بینکنگ کے میدان میں بعض علما اور تجار حضرات کی کوششوں سے اسلامی بینکنگ کا آغاز ہوا ہے جس میں ابھی مزید بہت بہتری اور تبدیلی و اصلاح کی گنجائش ہے، وہیں انشورنس کے حرام ہونے کے باوجود معاشرہ میں اس کی ضرورت کو دیکھتے ہوئے اس کا اسلامی متبادل تلاش کرنے کی کوشش کی گئی اور جو بالآخر "تکافل" یا Cooperating Insurance یا Islamic Insurance کے نام سے ہمارے سامنے آئی۔ اس کاوش کو کئی علماء نے سراہا اور اسے حلال بھی قرار دیا[1]۔

ان علماء کے نزدیک تکافل یا اسلامی انشورنس کی بنیاد اس بات پر ہے کہ وہ تعاون پر مبنی ہے، اس میں صارف سے کسی قسم کا عوض نہیں لیا جاتا، چونکہ یہ معاملہ تعاون پر مبنی ہے لہذا اس میں اگر سود یا جوا کی شکل ہو بھی تو تکافل حرام نہیں ہے، کیونکہ شریعت اسلامی کا یہ اصول ہے کہ تعاون میں وہ چیزیں بھی حلال ہو جاتی ہیں جو تجارت میں حرام تھیں، مثال کے طور پر تجارت میں یہ صورت حرام ہے کہ ایک شخص ایک لاکھ روپے دے کر دو لاکھ وصول کرے، یہ سود ہے، لیکن تعاون میں جائز ہے جیسے کوئی شخص کسی سے دو لاکھ ادھار لے لے اور بعد میں کہے کہ میں مجبور ہوں میں ایک لاکھ روپے تک ہی دینے کی استطاعت رکھتا ہوں اور ادھار دینے والا اس سے ایک لاکھ روپیہ لے لے اور ایک لاکھ چھوڑ دے، تو گویا مجبور شخص نے ایک لاکھ دے کر دو لاکھ وصول کیئے لیکن چونکہ یہ تعاون کی صورت تھی لہذا یہ جائز ہے۔

دیکھنا یہ ہے کہ کیا تکافل یا اسلامی انشورنس واقعی تعاون پر مبنی ہیں یا نہیں؟۔ کیونکہ تکافل میں واضح طور پر سود اور جوا کی وہ صورتیں جو عام انشورنس میں تھیں، موجود ہیں۔ اگر تکافل واقعی تعاون پر مبنی ہے تو اس میں موجود حرام معاملات کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے ورنہ تکافل میں اور کمرشل انشورنس میں کوئی فرق نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ تکافل کے اس بنیادی تصور اور صورت کو جو تکافل کمپنیوں اور اسلامی انشورنس کرنے والے اداروں میں رائج ہے بغور دیکھا جائے تو واضح طور پر اس میں عوض و معاوضہ، اور لین دین نظر آتا ہے جو تعاون کی روح کے منافی ہے اور تکافل کو تعاون کے پردہ سے نکال کر تجارتی معاہدے کی شکل دے دیتا ہے اور یہی وہ بنیادی اعتراض ہے جو تکافل کی حرمت کے قائلین علماء کی طرف سے اٹھایا جاتا ہے۔

[1] مجمع الفقه الإسلامي المؤتمر الثاني 22 – 28 ديسمبر 1985

تکافل کی تعریف:

تکافل عربی زبان کا لفظ ہے جس کا معنی ہے ایک دوسرے کا خیال رکھنا، ایک دوسرے کی کفالت کرنا، باہمی ذمہ داری وغیرہ۔

موجودہ تکافل کا بنیادی نظریہ کچھ اس طرح ہے کہ چند افراد مل کر رقم جمع کرتے ہیں جسے کسی کاروبار میں انویسٹ کیا جاتا ہے، تمام افراد اس رقم میں شریک ہوتے ہیں اور شرکت کا تناسب جمع کرائی گئی رقم کو دیکھ کر طے کیا جاتا ہے، یعنی اگر جمع کی گئی رقم ایک لاکھ ہے تو دس ہزار جمع کرانے والا دس فیصد کا حصہ دار ہوگا، جمع کی گئی رقم ایک وقف کی شکل اختیار کرلیتی ہے، اس میں جو منافع ہوتا ہے اس میں بھی سب شریک ہوتے ہیں، اس رقم کا اصل مقصد یہ ہوتا ہے کہ اگر کسی شریک کا کوئی نقصان ہوجائے تو اسے اس رقم میں سے پورا کیا جاتا ہے یعنی شریک اپنی رقم اسی شرط پر جمع کراتا ہے کہ اگر اس کا کسی خاص چیز (یعنی جس کی انشورنس کرارہا ہے) کو نقصان ہوا تو اس کا نقصان پورا کیا جائے گا چاہے اس کے برابر اس نے رقم جمع کرائی ہو یا نہیں، ہر شریک ایک خاص مدت تک، ماہانہ بنیادوں پر رقم جمع کراتا رہتا ہے، جب وہ مدت ختم ہوجاتی ہے اور شریک کو کوئی نقصان نہیں ہوتا تو اسے اختیار ہوتا ہے کہ وہ اپنی رقم منافع سمیت واپس لے لے اور چاہے تو مدت میں اضافہ کرلے۔

تکافل کمپنیوں میں تکافل کے حوالہ سے تین طرح کے نظام موجود ہیں:

1. مضاربہ۔
2. وکالہ۔
3. وقف۔

ان تینوں طرح کے نظام میں کچھ فرق تو ضرور ہے لیکن ایک بات سب میں مشترک ہے، وہ یہ کہ تکافل کرانے والا شخص اس بات کی شرط لگاتا ہے کہ تکافل فنڈ میں رقم جمع کرواکر جس چیز کا وہ انشورنس کرارہا ہے اس میں نقصان ہونے پر اس کی تلافی ضرور کی جائے گی، اور یہی شرط تعاون کے منافی ہے۔ اس کی وضاحت آگے ہوگی۔

تکافل میں اور عام انشورنس میں کچھ فرق ضرور ہیں جیسے:

☆ تکافل میں انشورنس کرانے والے کی حیثیت صارف کی نہیں ہوتی بلکہ وہ مجموعی رقم میں شریک بن جاتا ہے۔

☆ جمع شدہ رقم پر جو منافع آتا ہے وہ تمام شرکاء میں شراکت کے تناسب سے تقسیم ہوتا ہے، جبکہ انشورنس کمپنیاں اس منافع کو صرف اپنے پاس رکھتی ہیں صارف کو نہیں دیتیں۔

☆ تکافل میں مدت پوری ہونے کے بعد رقم واپس مل سکتی ہے، جبکہ انشورنس میں مکمل رقم واپس نہیں ہوتی۔

اس کے باوجود بھی یہ کہنا درست نہیں کہ تکافل میں جوا اور سود موجود نہیں ہے، بلکہ تکافل میں سود اور جوا دونوں موجود ہیں، اس کی وضاحت اس طرح ہے کہ:

☆ تکافل میں جو شریک ہے وہ قسطیں ادا کرتا ہے، اگر اس کی انشورنس کردہ چیز پر اسے نقصان ہو گیا تو تکافل کمپنی کی طرف سے اس کا عوض ادا کیا جائے گا جو یقیناً اس کی ادا کردہ قسطوں سے زیادہ ہو گا، تو یہی چیز سود ہے کہ پیسوں کے تبادلہ کے دوران ایک طرف سے زائد ادائیگی کرنا، یہ ربا الفضل یعنی زیادتی کا سود ہے۔

☆ تکافل میں رقوم جمع کرانے والے تمام افراد شرکاء ہیں، اگر ان شرکاء میں سے کسی ایک کو حادثہ پیش آجاتا ہے تو اسے تکافل کمپنی کی طرف سے ادائیگی کی جاتی ہے جبکہ جس شریک کو حادثہ پیش نہ آئے اسے اس کی رقم ہی واپس ملتی ہے تو یہ اس کے لئے ایک طرح کا نقصان ہے، تو بعض شرکاء نفع میں رہے بعض کو اصل رقم ہی واپس ملی لہذا یہ بالکل واضح جوا ہے۔

تکافل کو جائز کہنے والے افراد کے پاس اس کو جائز کہنے کی ایک ہی دلیل باقی رہ جاتی ہے کہ یہ معاملہ تعاون پر مبنی ہے، تمام شرکاء ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرتے ہیں، ہر شریک جو قسط دیتا ہے وہ اپنے دیگر شرکاء کے ساتھ تعاون کی نیت سے ہی ادا کرتا ہے، لہذا اس میں اگر کچھ معاملات حرام بھی ہیں تو بھی کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

اب ذرا اس پہلو کا جائزہ لیتے ہیں کہ کیا تکافل واقعی تعاون پر مبنی ہے؟ جواب یہ ہے کہ بالکل نہیں۔ تکافل مکمل طور پر ایک تجارتی معاہدہ ہے اس میں تعاون کی کوئی شکل نہیں، اس کی دلیل یہ ہے کہ:

☆ شریعت اسلامی کا یہ اصول ہے کہ جو شخص بھی تعاون کی نیت سے کوئی ادائیگی کرتا ہے جسے ہم صدقہ یا خیرات یا کوئی اور نام دے دیں، تعاون کی صورت میں ادائیگی کے بعد وہ مال اس کی ملکیت سے نکل جاتا ہے، وہ اس مال کا مالک نہیں رہتا، چہ جائے کہ وہ اس مال کو اپنا مال سمجھ کر اس کی واپسی کا مطالبہ کرے یا اس پر نفع طلب کرے، اور اس کو شریعت میں بہت برا عمل قرار دیا گیا ہے، نبی ﷺ کا فرمان ہے: ”اپنے دیئے گئے ہدیہ میں لوٹنے والا (یعنی اس کو واپس طلب کرنے والا) ایسے ہے جیسے ایک کتا ہو جو قے کرے اور پھر اس کو چاٹ لے“[1]۔

جبکہ تکافل میں یہ صورت واضح ہے کہ مدت پوری ہونے کے بعد اور کسی قسم کا نقصان نہ ہونے کی صورت میں تکافل میں اشتراک کرنے والا شخص اپنا مال واپس لے سکتا ہے، اس شرط کے ہوتے ہوئے تکافل کو تعاون کہنا کسی صورت صحیح نہیں۔

☆ تعاون ہمیشہ بغیر کسی عوض کے کیا جاتا ہے، ایسا نہیں ہوتا کہ کوئی شخص کسی کو ہدیہ دے اور اس کے بدلہ کوئی مطالبہ کرے، اگر وہ ایسا کرے گا تو یہ لین دین ہو جائے گا اور اس کا حکم تعاون کا نہیں رہے گا بلکہ وہ تجارت کے حکم میں آئے گا، امام کاسانی رحمۃ اللہ علیہ بدائع الصنائع میں لکھتے ہیں: ”اگر وہ ہدیہ دیتے وقت عوض (بدلہ) کی شرط لگا دے یعنی وہ یوں کہے کہ: میں تمہیں یہ چیز تحفہ میں دیتا ہوں اس شرط پر کہ تم مجھے وہ کپڑا دو گے“، تو ایسے معاہدہ کی نوعیت میں اختلاف ہے، ہمارے تینوں اصحاب (امام ابو حنیفہ، امام ابو یوسف، اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہم) یہی کہتے ہیں کہ یہ معاہدہ ہے تو ہدیہ کا لیکن اس کا حکم تجارت کا ہو گا، اور کبھی وہ اس طرح بھی کہتے ہیں کہ یہ معاہدہ ابتداء میں تو ہدیہ ہے لیکن آخر میں آکر یہ تجارت میں بدل گیا ہے“۔[2]

تکافل کے نظام میں بھی عوض کی شرط موجود ہے، جب کوئی شخص تکافل میں اشتراک کرتا ہے تو معاہدہ میں یہ شرط موجود ہوتی ہے کہ اس رقم کے بدلہ میں اس کی کسی مخصوص چیز میں نقصان ہونے پر تلافی کی رقم ادا کی جائے گی، عوض ادا کرنے کی یہ شرط تکافل کے معاہدہ کو تجارتی معاہدہ میں بدل دیتی ہے۔

---

[1] صحیح بخاری (2589)

[2] بدائع الصنائع (6\ 132)

☆ تکافل میں اور کمرشل انشورنس میں کوئی فرق نہیں، دونوں معاہدوں میں بنیادی طور پر پانچ شروط ہوتی ہیں:

1. انشورنس کرانے والا کون ہے، اور انشورنس دینے والا کون۔
2. کس چیز کی انشورنس کی جارہی ہے۔
3. ماہانہ کتنی قسط ادا کی جائیگی۔
4. نقصان کی صورت میں کتنی ادائیگی کی جائیگی۔
5. معاہدہ مکمل ہوتے ہی دونوں فریق پر اسے پورا کرنا لازم ہوگا، جو معاہدہ ختم کرے گا یا اس کی شروط پوری نہیں کرے گا دوسرا فریق اس کی رقم کا حقدار ہوگا۔

ان شروط سے یہ واضح ہورہا ہے کہ تکافل اور کمرشل انشورنس دونوں معاہدے ایک ہی خطوط پر استوار کئے گئے ہیں بس ناموں کے ساتھ ساتھ چند چیزوں کا فرق ہے۔

☆ عموماً یہ کہا جاتا ہے کہ تکافل میں شریک شخص جو قسطیں ادا کررہا ہے وہ تعاون کے طور پر ادا کررہا ہے۔ دین اسلام میں تعاون کرنے والے پر کسی قسم کی زبردستی نہیں ہوتی، تعاون کرنے والا چاہے تو زیادہ ادا کرے چاہے کم، چاہے تو منع کردے، تو ہمارا سوال یہ ہے کہ یہ شریک شخص اگر قسطیں روک دے، یا کم ادا کرے تو کیا اس کا تکافل کمپنی سے معاہدہ برقرار رہے گا؟ کیا نقصان کی صورت میں تکافل کمپنی اس کے نقصان کی ادائیگی کرے گی؟، یقیناً اس کا جواب نہیں میں ہوگا، یہیں سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ تکافل کا معاملہ تعاون پر مبنی نہیں ہے بلکہ کلی طور پر ایک تجارتی معاہدہ ہے۔

گزشتہ تمام باتوں کا خلاصہ یہ ہے کہ تکافل ایک غیر شرعی تجارتی معاہدہ ہے جسے تعاون کا لبادہ پہنا کر اس میں موجود غیر شرعی اور حرام معاملات کو جائز کہنا، حرام کو حلال کہنے کے مترادف ہے، اور اس کی قرآن وحدیث میں بڑی سخت وعیدیں وارد ہیں۔

ایک ضروری وضاحت:

تکافل کو جائز کہنے والے افراد کی طرف سے یہ بات بڑی شد و مد کے ساتھ کہی جاتی ہے کہ تکافل کو اکثر علماء نے جائز قرار دیا ہے، خاص طور پر مالی معاملات میں انتہائی محتاط علماء کمیٹی یعنی سعودی عرب کی کبار

علماء کمیٹی نے بھی اسے جائز قرار دیا ہے۔

حقیقت حال یہ ہے کہ افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ مال و منافع کی حرص میں آکر علماء اور عوام دونوں کے سامنے غلط بیانی کی گئی ہے، علماء کے سامنے تکافل کی جو صورت بیان کی گئی وہ موجودہ تکافل سے قطعی مماثلت نہیں رکھتی، اور صرف نام ایک جیسا رکھ کر عوام کو بیوقوف بنایا جارہا ہے، اس دھوکہ دہی سے خبردار کرتے ہوئے سعودی عرب کی اسی علماء کمیٹی نے اپنے حالیہ فتوی میں موجودہ تکافل کی صورت کو حرام قرار دیا ہے، مکمل فتوی کا ترجمہ درج ذیل ہے:

"حمد و ثناء کے بعد: بیشک علماء کمیٹی پہلے کمرشل انشورنس کی حرمت کا فتوی جاری کرچکی ہے کیونکہ اس میں دھوکہ ہے، جوا ہے، اور لوگوں کے اموال کو باطل طریقہ سے ہڑپ کیا جاتا ہے، اور یہ ایسے معاملات ہیں جنہیں شریعت نے حرام قرار دیا ہے اور ان سے سختی سے منع کیا ہے۔

اور اسی طرح علماء کمیٹی نے تعاون پر مبنی انشورنس (تکافل) کے جواز کا فتوی بھی دیا تھا جس کی صورت یوں (بیان کی گئی) ہے کہ نیک ومالدار افراد صدقہ خیرات جمع کریں جس سے محتاج و مجبور افراد کی مدد کی جائے، اور رقم جمع کرانے والوں کو اس رقم سے کچھ بھی واپس نہیں ملے گا، نہ اصل مال نہ ہی منافع اور نہ ہی کوئی اور بدل، کیونکہ تعاون کرتے ہوئے مال جمع کرانے والے کا مقصد صرف اور صرف اللہ تعالی کی خوشنودی حاصل کرنا ہوتا ہے نہ کہ کسی قسم کا دنیاوی فائدہ، اور یہ تعاون اللہ تعالی کے اس فرمان میں مذکور ہے: ﴿ وَتَعَاوَنُواْ عَلَى ٱلۡبِرِّ وَٱلتَّقۡوَىٰۖ وَلَا تَعَاوَنُواْ عَلَى ٱلۡإِثۡمِ وَٱلۡعُدۡوَٰنِۚ ﴾ المائدۃ: 2

(ترجمہ: "اور تم نیکی کے کاموں اور تقوی پر تعاون کرو، اور گناہ کے کاموں اور ظلم وزیادتی پر تعاون نہ کرو"۔) اسی طرح نبی ﷺ کا فرمان ہے: "اللہ تعالی اس وقت تک اپنے بندہ کی مدد میں لگا رہتا ہے جب تک بندہ اپنے بھائی کی مدد میں لگا رہتا ہے"، اور یہ معاملہ بالکل واضح ہے اس میں کسی قسم کی الجھن نہیں۔

البتہ گزشتہ کچھ عرصہ سے بعض اداروں اور کمپنیوں کی طرف سے لوگوں کے سامنے معاملات کو خلط ملط کرنے اور حقائق کو پلٹنے کا سلسلہ جاری ہے، ان اداروں نے تجارتی انشورنس کو تعاونی انشورنس (تکافل) کا نام دیا ہوا ہے اور لوگوں کو دھوکہ دینے کے لئے اور خود کو سہارا دینے کے لئے اس کے جواز کو علماء کمیٹی کی طرف منسوب کرتے ہیں جبکہ علماء کمیٹی اس سے مکمل طور پر بری ہے، اور کمیٹی نے پہلے ہی تجارتی انشورنس اور تعاونی انشورنس کے درمیان فرق کو واضح کردیا ہے، لہذا نام بدلنے سے حقیقت نہیں بدلتی،

اسی لئے علماء کمیٹی نے حقائق کو ظاہر کرنے اور عوام کو اس دھوکہ سے خبردار کرنے کے لئے یہ فتوی جاری کیا ہے"۔ [1]

اس فتوی میں علماء کمیٹی نے واضح طور پر تحریر کیا ہے کہ جس تعاون پر مبنی انشورنس کے جواز کا فتوی جاری کیا گیا تھا وہ ایسا تعاونی انشورنس نظام ہے جس میں اشتراک کرنے والا شخص کسی قسم کے عوض کا مطالبہ نہ کرے، اور یہی تعاون کی روح ہے، جبکہ تکافل میں اشتراک کرنے والا ہر شخص جب تکافل کمپنی سے معاہدہ کرتا ہے تو اس میں یہ طے ہوتا ہے کہ اس کی طرف سے ادا کی جانے والی رقم کے بدلہ میں کمپنی اس کے ہونے والے ممکنہ نقصان کی تلافی کرے گی۔

قارئین کرام! اس تمام بحث کے مطالعہ کے بعد آپ یقیناً سمجھ سکتے ہیں کہ کس طرح حقائق کو مسخ کرکے اور بھرپور دھوکہ دہی کے ساتھ مسلمان عوام کو حرام کی طرف مائل کیا جارہا ہے۔ اللہ تعالی ہم سب کو ہدایت عطا فرمائے اور حق کو سمجھنے اور اس کی اطاعت کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

انشورنس کا صحیح اسلامی متبادل:

اللہ تعالی کبھی بھی اپنے بندوں کے لئے تنگی نہیں چاہتا بلکہ آسانیاں فراہم کرتا ہے، اللہ تعالی کا فرمان ہے: ﴿يُرِيدُ ٱللَّهُ بِكُمُ ٱلْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ ٱلْعُسْرَ ﴾ البقرة: ١٨٥

ترجمہ: "اللہ تعالی تمہارے ساتھ آسانی کرنا چاہتا ہے تنگی کرنا نہیں چاہتا"۔ اسی وجہ سے ہم دیکھتے ہیں کہ وہ تجارتی معاملات جنہیں شریعت نے حرام قرار دیا ہے حلال تجارتی معاملات کی نسبت بہت کم ہیں، اسی طرح کھانے پینے کی اشیاء جنہیں حرام قرار دیا گیا ہے وہ حلال کردہ اشیاء سے بہت کم ہیں، پھر شریعت کا یہ قاعدہ ہے کہ اگر کسی چیز کو حرام کیا جاتا ہے تو اس کا متبادل بھی ضرور دیا جاتا ہے، جیسے اللہ تعالی نے سود کو حرام کیا تو تجارت کو حلال کردیا، شراب حرام کی تو اور بہت سے مشروبات پینے کے لئے مہیا کردئے، زنا حرام کیا تو نکاح جائز کردیا اور اس کی رغبت دلائی غرض یہ کہ ہر حرام کے بدلہ میں ایک متبادل ضرور دیا ہے۔

موجودہ معاشرتی حالات میں انشورنس یقیناً بہت اہمیت کا حامل ہے، کاروبار کے لئے نامناسب حالات کی وجہ سے ہونے والے خسارہ کے علاوہ بدامنی کی وجہ سے عام آدمی کو جو نقصانات ہورہے ہیں ان کی تلافی ہونی چاہئے

---

[1] فتاوى اللجنة الدائمة (15\ البيوع \ رقم الفتوى 19406)

کیونکہ شریعت میں پانچ چیزوں کی حفاظت پر خصوصی توجہ دی گئی ہے، دین عقل جان مال اور عزت، اور ایک حقیقی اسلامی حکومت ان چیزوں کے تحفظ کو اپنا فرض سمجھتی ہے، لیکن زوال کا شکار امت مسلمہ میں ایسی حکومت ایک خواب بن چکی ہے، اب ضرورت اس بات کی ہے کہ انفرادی طور پر ایسے نقصانات کی روک تھام اور تلافی کی کوشش کی جائے، انشورنس اسی کوشش کا ایک مظہر ہے لیکن مال و دولت کے حریص افراد کے ہاتھوں یہ نظام بھی مجبور و مظلوم افراد کی مدد کے بجائے ایک تجارت بن کر رہ گیا، اسی طرح تکافل کا نظام بھی جو ابتدائی طور پر خالصتاً تعاون پر مبنی تھا اب تجارت میں ڈھل چکا ہے۔

گزشتہ چند صفحات میں یہ بات واضح ہوچکی ہے کہ انشورنس غیر شرعی معاملہ ہے تو شریعت مطہرہ میں یقیناً اس کا متبادل موجود ہوگا، ضرورت یہ ہے کہ اسے تلاش کیا جائے اور اسے قابل عمل بنایا جائے، انشورنس کا حقیقی متبادل جو تکافل اور انشورنس کی تمام ضروریات کو پورا کرتا ہے اور اس میں کوئی حرام معاملہ بھی نہیں ہے اور جس کی طرف سعودی عرب کی علماء کمیٹی نے بھی اشارہ کیا ہے وہ ہے "وقف"۔

وقف کی تعریف:

امام ابن قدامہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: "هو تحبيس الأصل وتسبيل المنفعة"۔ یعنی اصل مال کو روک لینا اور اس کے منافع کو اللہ کے راستے میں خرچ کرنا۔

وقف کی اصل ہمیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث میں ملتی ہے جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمر رضی اللہ عنہ کو وقف کرنے کا مشورہ دیا تھا، اور اسی حدیث میں ہمیں وقف کے احکام ومسائل کا صحیح علم ہوتا ہے، حدیث یہ ہے کہ: "عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ عمر رضی اللہ عنہ کو خیبر سے حصہ میں کچھ زمین ملی تو عمر رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اس زمین کے بارے میں مشورہ کے لئے گئے اور کہنے لگے: "اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! مجھے خیبر سے کچھ زمین ملی ہے اور اس سے بہتر مال مجھے آج تک نہیں ملا، تو آپ مجھے اس بارے میں کوئی مشورہ دیں" نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اگر تم چاہو تو (یوں کرو کہ) اس کے اصل کو روک لو اور اس کے منافع کو اللہ تعالی کے راستہ میں صدقہ کردو" تو عمر رضی اللہ عنہ نے یوں ہی کیا کہ اسے صدقہ کردیا، اس شرط پر کہ نہ تو اسے بیچا جائے گا، نہ ہدیہ کیا جائے گا نہ وراثت میں تقسیم ہوگا اور اس زمین کو فقراء مساکین قریبی رشتہ داروں، گردن آزاد کرانے میں، جہاد میں، مسافر اور مہمان کے لئے صدقہ کردیا، اور یہ بھی کہ جو اس کی دیکھ بھال کرے گا اس کے لئے جائز ہے کہ وہ اپنی ضرورت کے مطابق اس میں

سے لیتا رہے لیکن اس سے زیادہ مال جمع کرنے کی کوشش نہ کرے"[1]۔

اس حدیث سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ:

- ✪ ایسی چیز وقف کی جائے گی جو ہمیشہ باقی رہے، جیسے زمین وغیرہ، اسی وجہ سے بعض علماء کے نزدیک روپیہ کو وقف کرنا درست نہیں، لیکن راجح قول یہ ہے کہ روپیہ کو وقف کرنا درست ہے اس شرط پر کہ اس روپیہ سے ایسا کاروبار کیا جائے یا ایسی جگہ لگایا جائے جہاں سے اس کا منافع آتا رہے۔
- ✪ وقف کو بیچنا یا واپس لینا جائز نہیں کیونکہ وقف ایک طرح کا صدقہ ہے۔
- ✪ وقف کرنے والا اگر چاہے تو وقف کی جہتیں معین کر سکتا ہے یعنی وہ یہ کہہ سکتا ہے کہ اسکا منافع صرف مساکین کے لئے، یا صرف جہاد کے لئے ہے وغیرہ۔
- ✪ وقف کی دیکھ بھال کرنے والا اس میں سے اپنی اجرت لے سکتا ہے۔

ان تمام باتوں کو سامنے رکھتے ہوئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ وقف، انشورنس کا صحیح متبادل ہے، اور اگر تاریخ اسلامی پر نظر ڈالی جائے تو ہمیں بیشمار ایسے اوقاف نظر آئیں گے جو خصوصاً مصیبت زدہ افراد کے ساتھ تعاون کے لئے بنائے گئے تھے۔

انشورنس کے متبادل کے طور پر وقف کو استعمال کرنے کے لئے اس کا بنیادی ڈھانچہ کچھ یوں بنایا جاسکتا ہے کہ:

- ☜ چند مخیر حضرات مل کر کچھ رقم وقف کریں۔
- ☜ اس وقف شدہ رقم کو کسی حلال کاروبار میں لگا دیا جائے اور اس کا منافع جمع کیا جاتا رہے۔
- ☜ اس وقف کے منافع کو چند مخصوص مصائب کے لئے خاص کر دیا جائے، مثلاً اس طرح کہ یہ وقف صرف ان افراد کے لئے ہے جن کی گاڑی کو حادثہ پیش آجائے، یا ان افراد کے لئے جو کینسر میں مبتلا ہوں اور علاج کی طاقت نہ رکھتے ہوں، یا ان افراد کے لئے جو بیروزگار ہوں اور مالی مشکلات کا شکار ہوں، یا بیواؤں کے لئے، یا یتیموں کے لئے، غرض یہ کہ کسی بھی مصیبت یا مصائب اور حالات کے شکار افراد کو خاص کیا جاسکتا ہے۔
- ☜ وقف میں رقم دینے والے مخیر حضرات میں سے اگر کوئی اس مصیبت کا شکار ہوتا ہے تو اس کے لئے بھی وقف سے حصہ نکالا جائے گا۔

---

[1] صحیح البخاری (2617)

☜ وقف کی دیکھ بھال کرنے والے افراد یا کمپنی کو اس وقف کی دیکھ بھال کی اجرت یا خرچہ اسی وقف کے منافع سے ادا کیا جائے گا۔

☜ وقف میں حصہ ڈالنے والے مخیر حضرات میں سے کوئی بھی وقف کی اصل رقم اور نہ ہی اس کے منافع کا مطالبہ کرے گا، کیونکہ یہ وقف خالصتاً اللہ تعالی کی رضا کے حصول اور مستحقین کی امداد کے لئے قائم کیا جائے گا۔

یہ صرف ایک ابتدائی خاکہ ہے جسے عملی تصویر پہنانے میں یقیناً بہت محنت درکار ہے لیکن اگر اس طرح کہ چند اوقاف بنالئے جائیں اور انہیں چند مخصوص مصائب میں گرفتار افراد کے تعاون کے لئے خاص کردیا جائے تو اس کا معاشرہ پر بہت اچھا اثر پڑے گا، اس وقف کی رقم کو کاروبار میں لگانے سے نئی ملازمتیں ملیں گی، اور اس کے منافع سے کئی مستحقین کے ساتھ تعاون بھی ہو گا اور چونکہ یہ ایک اجتماعی عمل ہو گا جو کہ باقاعدہ منصوبہ بندی کے ساتھ کیا جائے گا اسی لئے اس کے نتائج بھی بہت بہتر اور دوررس نکلیں گے۔

حقیقت یہ ہے کہ عالم اسلام میں آج بھی ایسے اوقاف موجود ہیں جن کی جہتیں متعین ہیں، کوئی وقف خالصتاً بیواؤں کے لئے ہے، کوئی یتیموں کے لئے ہے، کوئی وقف قرض لینے والوں کے لئے خاص ہے اور انہیں بغیر سود کے قرض مہیا کرتا ہے، کسی وقف کے تحت ایک اسپتال ہے جس میں مریضوں کا مفت علاج کیا جاتا ہے، ایک بہترین وقف کی زندہ مثال وقف الملک عبدالعزیز ہے جو کہ ایک (۷۲) بہتر منزلہ عمارت ہے اور بیت اللہ کے بالکل سامنے ہے یہ ایک ہوٹل ہے جس کا نام ابراج زمزم (زمزم ٹاور) ہے اس کی ساری آمدنی کو مسجد الحرام کے اخراجات کے لئے وقف کیا گیا ہے۔

اگر ان اوقاف کی جہتوں میں کچھ توسیع کرلی جائے اور ان میں وہ چیزیں بھی شامل کردی جائیں جن کا انشورنس کرایا جاتا ہے تو یہ یقیناً سودی انشورنس اور تکافل کے نظام سے ایک بہت بہتر نظام اور بالاتفاق جائز معاملہ ہو گا۔ دشواری صرف اس بات کی ہے کہ تعاون میں بھی تجارت ڈھونڈنے اور دین سے دنیا حاصل کرنے والے افراد کو یقیناً یہ کاوش پسند نہیں آئے گی اور وہ اسے پیسوں کا ضیاع اور کاروباری گھاٹا تسلیم کریں گے۔

دنیا کی نظر میں یقیناً صدقہ کرنے والے کو اس کے صدقہ میں سے کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا، لیکن "دنیا فانی ہے" کے فلسفہ پر یقین رکھنے والے اور اخروی زندگی پر ایمان لانے والے کا عقیدہ یہ ہے کہ ہمیں حاصل ہی وہ ہوتا ہے جو ہم اللہ کے راستہ میں خرچ کرتے ہیں، نبی کریم ﷺ کا فرمان ہے: "جب آدم کا بیٹا مرتا ہے تو اس کے سارے اعمال منقطع ہو جاتے ہیں، سوائے تین اعمال کے، صدقہ جاریہ، ایسا علم جو نفع پہنچائے، وہ نیک اولاد جو اس کے لئے دعا کرے"[1]۔

وقف صدقہ جاریہ کی بہترین عملی تصویر ہے، وقف کرنے والے یا وقف میں حصہ ڈالنے والے جب تک زندہ ہیں وہ کسی حادثہ کا شکار ہونے کی صورت میں اپنے وقف سے مستفید ہو سکتے ہیں، اور ان کی زندگی میں اور وفات کے بعد بھی یہ وقف ان کے لئے اجر و ثواب کا باعث بنا رہے گا۔



[1] صحیح مسلم , کتاب الوصیة 1635

فتح قسطنطنیہ کے حوالے سے منقول روایات کا تحقیقی مطالعہ

تحریر شیخ ابراہیم المحیمید بمع تعلیق شیخ ابی عمر العتیبی

تلخیص و ترجمہ: عمران فیصل [1]

فتح قسطنطنیہ کے حوالے سے منقول روایات دو قسم کی ہیں۔

پہلی قسم: ایسی احادیث جو ان افراد کی فضیلت میں وارد ہوئی ہیں جو سب سے پہلے اس شہر پر لشکر کشی کریں گے۔

دوسری قسم: وہ احادیث جن میں ان لوگوں کی فضیلت کا تذکرہ ہے جن کے ہاتھ پر یہ شہر فتح ہو گا۔

اب اس تقسیم کو سمجھنے کے لئے ہم فتحِ قسطنطنیہ سے متعلق وارد روایات کا جائزہ لیتے ہیں۔

حدیث نمبر ❶: صحیح بخاری میں ام حرام بنت ملحان رضی اللہ عنہا سے روایت ہے فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ: ”میری امت میں سب سے پہلے جو لوگ قیصر کے شہر میں جنگ کریں گے، وہ مغفور (یعنی بخش دیئے جائیں گے) ہیں میں نے عرض کیا کہ رسول اللہ کیا میں ان لوگوں میں سے ہوں آپ نے فرمایا نہیں“۔ [2]

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: قیصر کے شہر سے مراد یہاں قسطنطنیہ ہے۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”اس بات پر اجماع واتفاق ہے کہ وہ لشکر جو سب سے پہلے قسطنطنیہ پر حملہ آور ہوا وہ یزید بن معاویہ کی قیادت میں تھا اور اس کی قیادت میں بعض صحابہ بھی اس لشکر میں شریک تھے جن میں جناب ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کا بھی شامل ہیں“ ۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے یہ بات اس سوال کے جواب میں ارشاد فرمائی جس میں آپ سے دریافت کیا گیا کہ کیا یزید پر لعنت کرنا جائز ہے یا نہیں؟۔ [3]

---

[1] فاضل مدینہ یونیورسٹی

[2] صحيح البخاري ، كتاب الجهاد باب غزو البحر (ما قيل في قتال الروم)

[3] مجموع الفتاویٰ تیسری جلد کی ابتدا

حدیث نمبر ❷ : صحیح مسلم میں ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "تم نے ایک شہر سنا ہے جس کی ایک جانب خشکی میں اور دوسری طرف سمندر میں ہے؟" صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: جی ہاں اے اللہ کے رسول ﷺ۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "قیامت اس وقت تک قائم نہ ہوگی یہاں تک کہ بنو اسحاق میں سے ستر ہزار آدمی جنگ نہ کرلیں، جب وہ وہاں آئیں گے تو اتریں گے، وہ نہ ہتھیاروں سے جنگ کریں گے اور نہ تیر اندازی کریں گے وہ کہیں گے لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَاللَّهُ أَكْبَرُ تو اس سے اس شہر کی ایک طرف گر جائے گی، ثور[1] نے کہا: میں سمندر کی طرف کے علاوہ کوئی دوسری طرف نہیں جانتا، پھر وہ دوسری مرتبہ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَاللَّهُ أَكْبَرُ کہیں گے تو ان کی لئے کشادگی کردی جائے گا اور وہ اس میں داخل ہوجائیں گے اور مال غنیمت لوٹ لیں گے، پس اسی دوران کہ وہ مال غنیمت آپس میں تقسیم کررہے ہوں گے کہ انہیں ایک چیخ سنائی دے گی جو کہہ رہا ہوگا کہ: دجال نکل چکا ہے تو وہ ہر چیز چھوڑ کر واپس لوٹ جائیں گے۔[2]

حدیث نمبر ❸: صحیح مسلم میں ہی روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: " قیامت اس وقت تک قائم نہ ہوگی یہاں تک کہ رومی اعماق یا دابق میں اتریں ان کی طرف ان سے لڑنے کے لئے ایک لشکر مدینہ سے روانہ ہوگا اور وہ ان دنوں زمین والوں میں سے نیک لوگ ہوں گے، جب وہ صف بندی کریں گے تو رومی کہیں گے کہ: "تم ہمارے اور ان کے درمیان دخل اندازی نہ کرو جنہوں نے ہم میں سے کچھ لوگوں کو قیدی بنالیا ہے ہم ان سے لڑیں گے"، مسلمان کہیں گے: "نہیں اللہ کی قسم ہم اپنے بھائیوں کو تنہا نہ چھوڑیں گے کہ تم ان سے لڑتے رہو"، بالآخر وہ ان سے لڑائی کریں گے، بالآخر ایک تہائی مسلمان بھاگ جائیں گے جن کی اللہ کبھی بھی توبہ قبول نہ کرے گا، اور ایک تہائی قتل کئے جائیں گے جو اللہ کے نزدیک افضل الشہداء ہوں گے، اور تہائی فتح حاصل کرلیں گے انہیں کبھی آزمائش میں نہ ڈالا جائے گا، پس وہ قسطنطنیہ کو فتح کریں گے، جس وقت وہ آپس میں مال غنیمت تقسیم کررہے ہوں گے اور ان کی تلواریں زیتون کے درختوں کے ساتھ لٹکی ہوئی ہوں گی تو اچانک شیطان چیخ کر کہے گا: تحقیق مسیح دجال

---

[1] حدیث کی سند میں ایک راوی

[2] صحیح المسلم ، کتاب الفتن -

تمہارے بال بچوں تک پہنچ چکا ہے، وہ وہاں سے نکل کھڑے ہوں گے لیکں یہ خبر باطل ہو گی، جب وہ شام پہنچیں گے تو اس وقت دجال نکلے گا، اسی دوران کہ وہ جہاد کے لئے تیاری کر رہے ہوں گے اور صفوں کو سیدھا کر رہے ہوں گے کہ نماز کے لئے اقامت کہی جائے گی اور عیسیٰ بن مریم علیہ السلام نازل ہوں گے اور مسلمانوں کی نماز کی امامت کریں گے، پس جب اللہ کا دشمن انہیں دیکھے گا تو وہ اس طرح پگھل جائے گا جس طرح پانی میں نمک پگھل جاتا ہے اگرچہ عیسیٰ علیہ السلام اسے چھوڑ دیں گے تب بھی وہ پگھل جائے گا یہاں تک کہ ہلاک ہو جائے گا، لیکن اللہ تعالی اسے عیسیٰ علیہ السلام کے ہاتھوں سے قتل کرائیں گے پھر وہ لوگوں کو اس کا خون اپنے نیزے پر دکھائیں گے"۔ [1]

قاضی عیاض رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مذکورہ روایت میں " **بنی اسحاق** "کی جگہ محفوظ لفظ "**بنی اسماعیل**" ہے۔

ان احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ قسطنطنیہ کا معرکہ تین اقسام پر مشتمل ہے۔ ان میں دو قسموں میں فتح کا ذکر ہے۔ اور وہ فتح بھی دو قسم کی ہے۔

فتح کی پہلی قسم: عمومی فتح جو کہ روما شہر کی فتح سے قبل ہو گی۔

اسی فتح کے حوالے سے عبد اللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث ہے: فرماتے ہیں کہ:"ایک مرتبہ ہم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے ہوئے تھے اور کچھ نوٹ کرر ہے تھے جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ کون سا شہر پہلے فتح ہو گا، قسطنطینہ یا رومیہ؟ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہر قل کا شہر پہلے فتح ہو گا۔[2] یعنی (قسطنطنیہ) [3]

فتح کی دوسری قسم: یہ فتح چند درجِ ذیل امور سے مقید کی گئی ہے۔

1. یہ فتح دجال کے زمانے سے پہلے ہو گی۔
2. سخت خون ریزی کے وقت ہو گی۔

---

[1] صحيح المسلم ، كتاب الفتن.

[2] سنن الدارمي.

[3] یہ پہلی فتح خلافت عثمانیہ میں ہو چکی ہے۔ کیونکہ قسطنطنیہ کا علاقہ پہلے بلاد کفر میں شمار ہوتا تھا پھر اس میں اسلام داخل ہوا۔ اور مسلمانوں نے وہاں ایک عرصہ دراز تک حکومت کی۔

3. یہ فتح تکبیر سے ہو گی۔
4. اس فتح میں شریک لوگ انتہائی نیک اور اصحاب فضل و شرف کے حامل ہوں گے۔

مذکورہ بالا دو فتوحات قسطنطنیہ کے معرکہ کی دو قسمیں ہیں جبکہ اس کے معرکہ کی تیسری قسم وہ ہے جس میں اس علاقہ پر لشکر کشی کرنے والی پہلی فوج کو مغفرت کی بشارت دی گئی ہے۔ جو کہ یزید بن معاویہ کی قیادت میں کی گئی تھی۔

خلاصہ کلام: یہ کہ قسطنطنیہ کے حوالے سے کتب احادیث میں وارد روایات کی دو اقسام ہیں۔

1. ایسی احادیث جن میں اس شہر پر سب سے پہلے لشکر کشی کرنے والی فوج کی فضیلت وارد ہوئی ۔جو کہ یزید بن معاویہ کے دور میں مکمل ہوئی۔
2. وہ احادیث جن میں ان لوگوں کی فضیلیت کا تذکرہ ہے جن کے ہاتھ پر یہ شہر فتح ہو گا۔

اور یہ فتوحات دو قسم کی ہیں:

1. پہلی عمومی فتح جو روما شہر کی فتح سے قبل ہو گی اور یہ ہو چکی ہے۔
2. دوسری فتح کو احادیث میں چند امور سے مقید کیا گیا ہے۔ اور یہ فتح ابھی ہونی باقی ہے۔ جو کہ ظہور دجال کے زمانہ سے کچھ پہلے ہو گی۔ اور تیسرے معرکہ میں محض لشکر کشی کا ذکر ہے فتح کا نہیں جو کہ یزید کی قیادت میں ہوئی۔ اس تطبیق سے قسطنطنیہ کے حوالے سے وارد تمام احادیث میں جمع ممکن ہے (والعلم عند اللہ)



عربی لینگویج وفہم دین۔ایک سالہ ڈپلومہ کورس 2012

(پہلے بیچ کی کامیابی کے ساتھ تکمیل کے بعد دوسرے بیچ کی کلاسز کا آغاز)

اسلامک یونیورسٹی مدینہ منورہ میں پڑھایا جانے والا دوسالہ عربی لیگویج کورس اب ایک سال میں آپ کی دسترس میں!

یقیناً آپ چاہتے ہوں گے ۔۔۔؟

- ہر قسم کے تعصبات وتنازعات سے دور رہ کر قرآن کریم کی زبان اور اس کی تعلیمات کو سمجھیں۔
- جدید تقاضوں کے مطابق بنیادی اسلامی علوم سے روشناس ہوں۔

تو آیئے ''المدینہ اسلامک ریسرچ سینٹر'' کے زیر اہتمام، مدینہ یونیورسٹی کے سند یافتہ اسکالرز کی زیرِ نگرانی مندرجہ ذیل علوم سیکھنے کے نادر موقع سے مستفید ہوں۔

❀ ترجمہ وتفسیر قرآن مجید ❀ حدیث ❀ اصولِ حدیث ❀ فقہ ❀ اصول فقہ
❀ بنیادی اسلامی عقائد ❀ عربی لینگویج ❀ عربی گرامر ❀ سیرت نبوی ﷺ
❀ جدید فقہی ومالی معاملات

خصوصیات:

- مدینہ یونیورسٹی سے اعلیٰ تعلیم یافتہ اساتذہ کرام
- مرکز سے متصل جامع مسجد
- ایک سال میں تین سمسٹر
- ملٹی میڈیا کلاسز
- ڈپلومہ سرٹیفیکٹ
- ایئر کنڈیشن کلاس روم
- یومیہ ریفریشمنٹ

تقریب تقسیم اسناد اور تعارفی پروگرام کی حتمی تاریخ کا اعلان عنقریب کردیا جائے گا انشاءاللہ

رجسٹریشن: مؤرخہ 10 جنوری 2012

کورس شیڈول:

ایام: پیر، منگل، بدھ، جمعرات

اوقات کلاس: 7 بجے تا 9:30 (شام)

کورس فیس: 1200 (ماہانہ)

کلاسز کا آغاز یکم فروری 2012



المدینہ اسلامک ریسرچ سینٹر
متصل مسجد سعد بن ابی وقاص۔ ڈیفنس فیز 4، 11 کمرشل اسٹریٹ، نزد نثار شہید پارک وگزری پولیس اسٹیشن کراچی
www.islamfort.com

رابطہ: عثمان صفدر/شعیب اعظم مدنی: فون: 02135896959، 0300221021[illegible]، 03082167324